مسجد قرطبہ

☆تعارف اور پس منظر (اقبال کی طویل نظمیں: فکری اور فنّی مطالعہ)

رفیع الدین ہاشمی: وزٹنگ پروفیسر، شعبۂ اردو۔ یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور

مع مطالب از مولانا غلام رسول مہر

علامّہ اقبال اکتوبر ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن روانہ ہوئے۔ کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد پیرس ہوتے ہوئے جنوری ۱۹۳۳ء میں ہسپانیہ پہنچے۔ ہسپانیہ کے وزیر تعلیم پروفیسر آسن کی درخواست پر انھوں نے میڈرڈ یونی ورسٹی میں The Intellectual World of Islam and Spain ... کے موضوع پر لکچر دیا۔ اس سفر کے دوران میں، انھیں ہسپانیہ کے کئی دوسرے شہروں (طلیطلہ، قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ) کی سیاحت کا موقع ملا۔ ہسپانیہ صدیوں تک مسلم تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ اس لیے اقبال کو اس خطے سے خصوصی تعلق خاطر تھا۔ نظم "ہسپانیہ" میں کہتے ہیں:

ہسپانیہ تو خون مسلماں کا امیں ہے
مانند حرمِ پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

ہسپانیہ کے ۲۵ روزہ سفر کے بارے میں شیخ محمد اکرم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: "میں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجد قرطبہ پر بھی لکھی۔ الحمرا کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی"۔ (اقبال نامہ، دوم: ص ۳۲۱)

زیارتِ مسجد کا دل چسپ واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اقبال مسجد میں پہنچے تو بے اختیار چاہا کہ مسجد میں تحیۃ المسجد کے نفل ادا کریں۔ عمارت کے نگران سے نفل ادا کرنے کی اجازت مانگی تو اس نے کہا: میں بڑے پادری سے پوچھ آؤں۔ اُدھر وہ پوچھنے گیا، اِدھر علامّہ نے نیت باندھ لی اور اس کے واپس آنے سے پہلے ہی ادائے نماز سے فارغ ہو گئے۔ (ذکرِ اقبال: ص ۱۸۵) بعض روایات کے مطابق اقبال نے مسجد میں اذان بھی کہی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر صدیق جاوید کا مضمون "اقبال مسجد قرطبہ میں"۔ مشمولہ، اقبال، اقبال پر تحقیقی مقالے: ص ۱۱۵-۱۴۴) بہر حال یہ نظم علامّہ کی زیارتِ مسجد قرطبہ (۱۹۳۳ء) کی یادگار ہے اور جیسا کہ خود اقبال نے وضاحت کی ہے: "یہ ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی"۔ بالِ جبریل کی ایک اور نظم "دعا" مسجد کے اندر لکھی گئی۔

قرطبہ اور مسجد قرطبہ

قرطبہ (Cordova) اسپین کے صوبہ اندلوزیا (اندلس) کا معروف شہر ہے۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں صدر مقام رہا۔ آج بھی اس کے قدیم حصے میں واقع دروازوں، تنگ اور پر پیچ گلیوں، برجوں اور فصیل کے باقی ماندہ حصوں کی صورت میں قرطبہ کی عظمتِ رفتہ کے نشانات باقی ہیں۔ سونے اور چاندی کے پانی سے نقش نگاری کی صنعت آج بھی قرطبہ میں زندہ ہے۔ قرطبہ کی تاریخ کئی سال قبل مسیح پرانی ہے۔ قرطبہ سب سے پہلے ۷۱۱ء میں مسلمانوں کے زیر تسلط آیا۔ عبد الرحمن اول (۷۵۶-۷۸۸ئ) نے قرطبہ کو اپنی سلطنت کا دارالحکومت بنایا اور یہاں مسجد قرطبہ کی بنیاد رکھی۔ کسی زمانے میں یہاں سینٹ ونسٹ کا گرجا واقع تھا۔ مسلمانوں نے ۷۱۱ء میں اس کے ایک حصے کو مسجد بنالیا تھا۔ اب عبد الرحمن نے ایک لاکھ دینار کے عوض گرجے کا باقی حصہ خرید لیا اور یہاں مسجد تعمیر کی گئی۔

مسجد کا نقشہ عبد الرحمن الداخل (اول) نے خود ہی تیار کیا۔ اور تعمیر میں پہلی اینٹ بھی بہ نفس نفیس خود ہی رکھی۔ وہ بلاناغہ تعمیر مسجد کی نگہداشت کرتا بلکہ ایک روایت کے مطابق وہ روزانہ کچھ وقت کے لیے خود بھی معماروں اور مزدوروں کے شانہ بشانہ کام کرتا تھا۔ اس نے جگہ جگہ سے قیمتی پتھر اکٹھے کیے۔ سارا فرش سنگ مرمر کا بنوایا۔ چھت میں نقش و نگار بنوائے۔ دیواروں کو مزین کیا۔ ستونوں کو آراستہ و پیراستہ کیا۔ لمبے چوڑے دروازے اور خوش نما اور خوش شکل محرابیں بنوائیں۔ صنّاع اور نقش بنانے والے دور دور سے منگوائے گئے اور انھیں ہدایت کی گئی کہ مسجد کی خوب صورتی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا جائے۔ اس کی تعمیر میں تقریباً ایک لاکھ دینار خرچ ہوئے۔ ہال کے صدر دروازے کے باہر ایک باغیچہ اور وضو کے لیے تالاب بھی بنایا گیا۔

عبد الرحمن اول کی وفات کے بعد اس کے لائق فرزند ہشام اول (۷۸۸ئ-۷۹۶ئ) نے مسجد قرطبہ کی تعمیر کا کام جاری رکھا۔ وہ بھی اپنے والد کی طرح مزدوروں کے دوش بدوش تعمیر میں حصہ لیتا تھا۔ اس نے دور دور سے مختلف قسم کے پتھر اور مصالحے منگوائے۔ مجموعی طور پر اس نے ایک لاکھ ساٹھ ہزار دینار کی رقم مسجد کی تکمیل و زیبایش پر خرچ کی۔ عبد الرحمن دوم (۸۲۱ئ۔ ۸۵۲ئ) نے جنوب مشرق کی سمت مسجد کے رقبے میں توسیع کی۔ توسیع کے ساتھ ساتھ نقش و نگار کے ذریعے مسجد کے ظاہری حسن و زیبایش میں بھی اضافہ کیا گیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اندلس کے شاہان اموی مسجد قرطبہ کی توسیع، اس کی شان و شوکت، زیب و زینت اور خوب صورتی میں اضافے کو اپنا دینی فرض سمجھتے تھے۔ عبد الرحمن ناصر (وفات: ۹۴۱ئ) کے زمانے میں اس مسجد کی دل کشی اور حسن کا یہ عالم تھا کہ لوگ دور دور سے اس کی زیارت کو آتے تھے۔

الحکم ثانی نے ۱۵ اکتوبر ۹۴۱ء کو تخت نشین ہوتے ہی مسجد میں فوری توسیع کا حکم دیا۔ چنانچہ جنوب مشرقی سمت ہی میں عبدالرحمن دوم کی توسیع میں مزید اضافہ کیا گیا۔ یہ توسیع بھی قبلہ رخ تھی۔ مرکزی محراب بھی از سر نو بنائی گئی۔ یہی محراب آج کل زیارت گاہِ خاص وعام ہے۔ اس محراب کے اوپر ایک چھوٹا سا گنبد بھی تعمیر کیا گیا۔

الحکم ثانی کی توسیع، فن تعمیر کے نقطۂ نظر اور ظاہری حسن وجمال کے لحاظ سے بھی، مسجد کی سابقہ توسیعات پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس توسیع پر ہال میں بنائے گئے محرابوں کے سہاروں کے لیے نیلے اور سرخ رنگ کے پتھر استعمال کیے گئے تھے۔

آخری توسیع ۹۸۷ء اور ۹۹۰ء کے درمیان محمد بن ابی عامر (المعروف: المنصور) کے عہد اقتدار میں ہوئی ہے۔ اس موقع پر جنوب مشرق کی سمت اضافے کی گنجایش نہیں تھی کیوں کہ دریا قریب تھا، اس لیے المنصور نے مسجد کی شمال مشرقی دیواریں گرا کر نماز ہال کے رقبے میں اضافہ کیا۔ مسجد پہلے مستطیل شکل میں تھی، اب وہ مربع شکل اختیار کر گئی۔ صحن میں واقع باغیچے کے رقبے میں بھی توسیع ہو گئی۔ اس باغیچے میں وضو کے لیے حوض بنائے گئے تھے۔ پہاڑوں سے گرنے والی نہروں کے ذریعے ان میں پانی جمع ہوتا تھا۔

مسجد کا مینار پہلی بار ہشام نے بنوایا تھا۔ عبدالرحمن ثانی کے دور میں صحن میں اضافے کی وجہ سے اسے گرا کر موجودہ چار منزلہ مینار تعمیر کیا گیا جو ۴۰ میٹر بلند اور چوکور شاہے۔ یہ اپنے دور میں فن تعمیر کا ایک ایسا شاہ کار نمونہ تھا کہ مراکش کی بعض مساجد کے مینار اس کی نقل میں بنائے گئے اور اشبیلیہ کا جیرالڈا بھی اسی طرز پر تعمیر کیا گیا۔ اب اس مینار میں مسیحیوں نے متعدد تبدیلیاں کی ہیں اور اس میں گھنٹیاں لٹکا کر، اسے "گرجا گھر مینار (Cathedrea Tower)" بنالیا ہے۔

اصل مسجد میں ستونوں کی تعداد بارہ سو سے زائد تھی۔ تین چار سو کلیسا کی نذر ہو گئے، اب آٹھ سو سے کچھ زائد باقی ہیں مگر ان کا حسن وجمال اب بھی، دیکھنے والوں کو لبھاتا ہے۔ ان پر جس زاویے سے جدھر سے نظر دوڑائیں، ایک تناسب اور موزونیت کا احساس ہوتا ہے۔ قطار اندر قطار ستونوں اور محراب بر محراب کے سلسلے کو دیکھ کر بے اختیار علامّہ اقبال کا مصرع ذہن میں گونجتا ہے :

شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل

عیسائی تسلط کے بعد مسجد قرطبہ کے محرابوں اور دیواروں پر لکھی ہوئی آیات کو پلاسٹر سے چھپا دیا گیا تھا۔ یہ صورت حال کئی سو سال تک برقرار رہی۔ یہاں تک کہ یورپ میں نشأت ثانیہ کے دور کا آغاز ہوا۔ جدید علوم کی روشنی پھیلی اور مذہبی تعصّب میں کمی ہوئی تو مسجد قرطبہ کو عیسائی راہبوں سے لے کر محکمہ آثار قدیمہ کے حوالے کیا گیا۔ انھوں نے پلاسٹر اتارا تو قرآنی آیات کے نقوش اسی آن بان اور حسن وجمال کے ساتھ دوبارہ نظر آنے لگے۔ چھتوں پر لکڑی کا کام بھی بدستور موجود ہے۔ یہی چیز ہے جسے اقبال نے "رنگِ ثباتِ دوام" کہا ہے۔

فکری جائزہ

''مسجد قرطبہ'' کے مباحث کو مندرجہ ذیل عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ کائنات کا تکوینی نظام	۲۔ نظریۂ فن
۳۔ نظریۂ عشق	۴۔ مسجد قرطبہ کا جلال و جمال
۵۔ مردِ مومن	۶۔ مسلم ہسپانیہ کی عظمت و شکوہ

۷۔ اندلس میں احیاے اسلام

☆کائنات کا تکوینی نظام:

''مسجد قرطبہ'' میں شاعر نے سب سے پہلے زمانے کی اصل حقیقت اور کائنات میں برپا ہونے والے انقلابات کی ماہیت پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس نے تمہید اً کائنات کے تکوینی نظام کو واضح کیا ہے۔ یہ سلسلۂ خیال پہلے بند میں منظم شکل میں مربوط اشعار کے ذریعے بیان ہوا ہے جسے ترتیب واریوں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے روز و شب کا سلسلہ ایک خاص ارادے کے تحت اور ایک خاص مقصد کے خاطر تخلیق کیا ہے۔ کائنات میں واقع ہونے والے تغیرات و حادثات کا اس تخلیق سے گہرا تعلق ہے۔ پیدایش، موت اور ہر نوعیت کی دیگر تبدیلیاں اس خدائی نظام کا حصہ اور اس کے جاری رہنے کا لازمی تقاضا ہیں۔

۲۔ سلسلۂ روز و شب یعنی خدائی نظام کے جاری رہنے سے ہمیں ذات باری تعالیٰ کی صفات کا عرفان ہوتا ہے۔ کائنات کی رنگارنگ کیفیتیں اور نوع بہ نوع تبدیلیاں درحقیقت ذریعہ ہیں اس کو پہچاننے کا۔ اسماے الٰہی ننانوے ہیں، مثلاً: علیم، خبیر، خالق، قادر، حی، قیوم، سمیع وغیرہ اور یہی اس کی صفات ہیں۔

۳۔ خدا کی یہ کائنات، وسعت کے لحاظ سے بے حد و حساب اور لامتناہی ہے۔ اسی طرح اس کے اندر واقع ہونے والی تبدیلیاں اور انقلابات بھی لامحدود ہیں۔ یہ صورتِ حال کائنات کے غیر مختتم امکانات کو ظاہر کرتی ہے۔ یعنی انسان اپنے باطن میں پوشیدہ صلاحیتوں سے کام لے کر اور کائنات کے وسائل کے ذریعے، اصلاح ذات سے لے کر تسخیر کائنات تک کا کارنامہ انجام دے سکتا ہے اور یہ ''سازِ ازل'' (تخلیق کائنات) کی تکمیل ہوگی۔

۴۔ فرد یا قوم کو یہ فریضہ انجام دیتے ہوئے خیال رکھنا ہو گا کہ زمانہ ایسا صیرفیِ کائنات ہے جو کھری اور کھوٹی چیز کو پرکھ کر الگ الگ کر دیتا ہے۔ یہاں صرف کھرے سکوں کا چلن ہے۔ زمانہ صرف اس فرد اور قوم کو بقا کی ضمانت دیتا ہے جو ہمیشہ اپنے اعمال وافعال کا جائزہ لیتی رہتی ہے :

کرتی ہے جوہر زماں' اپنے عمل کا حساب

۵۔ اگر اس معاملے میں ذرا بھی کوتاہی کی جائے تو زمانہ ایسا بے لاگ منصف ہے جو کسی سے رورعایت نہیں کرتا۔ زمانے کے ہاتھوں ہر شے ہلاک اور فنا ہو جانے والی ہے اور یہ خدا کا تکوینی نظام ہے۔ اس مفہوم کو شاعر نے پہلے بند کے آخری شعر میں بہ تمام وکمال بڑی خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔

☆ نظریۂ فن:

''اول وآخر فنا'' کہہ کر شاعر نے قدرت کے تکوینی نظام کا جو قاعدہ کلیہ بیان کیا تھا' دوسرے بند کے پہلے شعر کے ذریعے اس میں ایک استثنائی صورت پیدا کی ہے کہ صرف وہ چیز فنا کی دست برد سے بچ سکتی ہے جس کی تخلیق میں کسی ''مردِ خدا'' کا ہاتھ ہو۔ تیسرے بند کے دو اشعار (نمبر ۲'۳) اور نظم کا سب سے آخری شعر' اسی سلسلۂ خیال کی کڑیاں ہیں۔ جس میں اقبال نے درحقیقت اپنے نظریۂ فن کی اہم ترین خصوصیت بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ فن مصوری کا ہو یا سنگ تراشی' تعمیر' موسیقی' نغمہ اور شاعری کا' محنت پیہم اور لگن کے بغیر اس میں پختگی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اسے بقا حاصل ہو سکتی ہے۔ کسی بھی فنی نقش میں ''رنگِ ثباتِ دوام'' پیدا کرنے کے لیے بقول میرؔ: ''بڑی خوش سلیقگی سے جگر خوں'' کرنا پڑتا ہے۔ اقبال نے دوسرے مقامات پر بھی فنی تکمیل کے لیے خون جگر کی ضرورت واہمیت پر زور دیا ہے :

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا

روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

☆ نظریۂ عشق:

کسی نقش میں رنگ ثبات دوام کے لیے اقبال نے شرط یہ عائد کی تھی کہ اس کی تکمیل کسی مردِ خدا کے ہاتھوں انجام پائی ہو۔ اقبال کے ہاں مردِ خدا اور کیفیتِ عشق لازم وملزوم ہیں' اسی لیے انھوں نے کہا :

مردِ خدا کا عمل' عشق سے صاحب فروغ

اور یہاں سے سلسلۂ خیال کا رخ عشق کی طرف مڑ جاتا ہے۔ دوسرے بند کے اختتام تک عشق کی اصلیت وحقیقت' اس کی مختلف کیفیتوں' اس کی قوّت' عظمت اور شان وشوکت کا بیان ہوا ہے۔

''مسجد قرطبہ'' میں اقبال نے ایک نئی جہت سے عشق کے تصوّر کو اجاگر کیا ہے۔ ان کا نظریۂ عشق یہاں انتہائی کامل (saturated) صورت میں نظر آتا ہے۔ اس کے اہم پہلو یہ ہیں:

ا۔ ''مسجد قرطبہ'' کے حوالے سے نظریۂ عشق کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ زمانے اور سلسلۂ روز و شب سے سلسلۂ خیال ملایا جائے تو ہم یوں کہیں گے کہ زمانہ، کائنات کی ہر شے کو فنا کر دینے والا ہے مگر عشق کو استثنا حاصل ہے۔ پہلے بند میں اقبال نے کہا تھا: ع

ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

اور:

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا

مگر عشق کے پاس زمانے کی رو (جو فنا کا دوسرا نام ہے) کے زہر کا تریاق موجود ہے۔ اس لحاظ سے وہ سب سے بڑی حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ کائنات کی سب سے بڑی طاقت بھی ہے۔

الف۔ عشق کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے ... جیسے: خدا کا کلام

ب۔ عشق غیر فانی ہے... جیسے: دم جبرئیل

ج۔ عشق کائنات کی مقدس ترین چیز ہے ... جیسے: خدا کا رسولؐ

د۔ عشق کائنات کی سب سے پاکیزہ شے ہے... جیسے: دل مصطفی

ہ۔ عشق ہی کائنات میں مقتدر اور حکمران ہے... جیسے: فقیہِ حرم اور امیر جنود

وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

۳۔ حیات و کائنات کی بقا کا انحصار عشق پر ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز متذکرہ بالا خصوصیات کی حامل ہو گی، وہی کائنات کا مرکز و محور ہو گی۔ اسی سے زندگی کے نغمے پھوٹیں گے اور نور و نار حیات بھی اسی کے مرہون منّت ہوں گے۔ یہ عشق کی انتہائی اعلیٰ اور کامل ترین صورت ہے۔ یوں سمجھئے کہ عشق بجلی کی اس رو (Current) کی مانند ہے جس سے کائنات کا پورا کارخانہ چل رہا ہے۔ اگر عشق کی رو منقطع ہو جائے تو پوری کائنات یک بہ یک گہری تاریکی میں ڈوب جائے اور پورا کارخانہ رک جائے۔ اس سے عشق کی حقیقی قوّت اور طاقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

☆مسجد قرطبہ کا جلال و جمال:

عشق کی قوّت و اہمیت واضح کرنے کے بعد، کلام کا رخ نظم کے اصلی موضوع مسجد قرطبہ کی طرف مڑ جاتا ہے۔ مسجد قرطبہ کا، جذبۂ عشق سے بہت قریبی تعلق ہے بلکہ مسجد قرطبہ کی بنا ہی عشق پر استوار ہے :

اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود

یہاں ضمنی طور پر تین باتیں مذکور ہوئی ہیں:

ا۔ نظریۂ فن جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

ب۔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے اور عظمت آدم کا اعتراف اور

ج۔ شاعر کا ذوق و شوق

مؤخر الذکر دونوں پہلو عشق کی مختلف کیفیات ہیں۔ ان کا سبب عشق ہے۔ تیسرے بند کے آخری پانچ شعر دراصل دوسرے بند کا تکملہ ہیں۔

چوتھے بند میں سلسلۂ خیال پھر مسجد قرطبہ کے وجود سے مربوط ہو جاتا ہے۔ تین اشعار میں اقبال نے مسجد کے جلال و جمال، عظمت و شکوہ، ظاہری حسن و زیبایش اور رعنائی کی طرف نہایت بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے۔ مسجد کے جلال و جمال کے بارے میں عابد علی عابد لکھتے ہیں:

"مسجد قرطبہ کی تعمیر میں جو فنی اور جمالیاتی نفاست ملحوظ رکھی گئی ہے، اس کی تعریف میں مشرق و مغرب کے نقاد دفتر کے دفتر لکھ چکے ہیں... رات کے وقت مسجد قرطبہ میں دو ہزار فانوس جگمگ جگمگ کرتے تھے۔ ان فانوسوں کی کیفیت یہ تھی کہ دو بتیاں ایک دوسرے کے اوپر جلتی تھیں۔ ان کے پردوں پر طرح طرح کے نقش و نگار بنے ہوتے تھے جن سے چھن چھن کر روشنی نکلتی تھی۔ جن زنجیروں سے فانوس لٹکے رہتے تھے، ان میں کنول کے پھول یا کھجور کے پتے یا انار بنے ہوتے تھے۔ ان پر آیاتِ قرآنی کندہ ہوتی تھیں... چمڑے کے منقش پردے [جن پر] سنہرا روپہلا کام ہوتا تھا... مسجد کی دیواروں پر بھی لٹکا دیے جاتے تھے۔ دیواروں کی پچی کاری کے ساتھ ان پردوں کی زیبایش مل کر دو ہزار فانوس کی روشنی میں رات کو دل پر کیا اثر پیدا کرتی ہو گی، اس کا اندازہ خود ہی کر لیجیے۔ (ماہِ نو، اقبال نمبر: اپریل ۱۹۷۰ء، ص ۱۰۸)

مسجد کے نادر الوجود ہونے کا اعتراف متعدد مسیحی مصنّفین، دانش وروں اور فن کاروں نے کیا ہے مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں مسجد کے عین وسط میں ایک گرجا تعمیر کر کے مسجد کی حیثیت کو مسخ کر دیا گیا۔ یہ گرجا بلاشبہہ بہت شان دار ہے۔ اس کے نقش و نگار، بت اور تاریخی مناظر، معماروں، نقاشوں اور مصوروں کی مہارت اور فن کاری کا اچھا نمونہ ہیں۔ اس کی تعمیر و تزئین اور آرایش اور مصوری میں یورپ کے بہت سے ممالک کے نامور فن کاروں نے حصہ لیا اور سالہا سال بلکہ نسل در نسل محنت و جگر کاوی میں مشغول رہے۔ یہ گرجا ۲۴۴ سال میں مکمل ہوا۔ چنانچہ اب یہ پوری عمارت عیسائیوں کے خیال میں، بنیادی طور پر کلیسا ہے، نہ کہ مسجد۔ اس عمارت کا سرکاری نام

"قرطبہ کا مسجد گرجا (La Mezquita Catedral de Cordoba)" ہے۔ مگر یہ گرجا مسجد کے اندر مسجد کو توڑ کر کیسے اور کیوں بنایا گیا؟ اس کا پس منظر دل چسپ ہونے کے ساتھ عبرت انگیز بھی ہے۔

مسیحی حکمران شاہ فرنانڈو سوم کی افواج ۲۹ جون ۱۲۳۶ء کو قرطبہ پر قابض ہوئیں تو شہری اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ، جان بچا کر بھاگ نکلے۔ فتح کے فوراً بعد، مسجد کے منارِ بلند پر صلیب چڑھادی گئی۔ ایک ہفتے کے بعد بشپ نے مسجد کو باضابطہ طور پر گرجے میں تبدیل کر دیا اور یہاں باقاعدگی کے ساتھ عبادت ہونے لگی۔ بعد کے زمانے میں مسجد کے اندر چھوٹے موٹے معبد بنائے جاتے رہے۔ سولھویں صدی میں بشپ الانسومانرک نے مسجد کو کیتھیڈرل بنانے کا حکم دیا۔ چنانچہ مسجد کے وسطی حصے کی توڑ پھوڑ شروع کر دی گئی۔ یہ ایسی نامعقول حرکت تھی کہ خود مسیحی حلقوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی، لیکن بشپ نے اس کی پروا نہیں کی۔ یہ کام میونسپل کونسل کی اجازت کے بغیر شروع کیا گیا تھا، اس لیے کونسل نے قرطبہ کے مجسٹریٹ کی تائید سے ایک حکم نامہ جاری کیا جس میں کہا گیا: مسجد کے کسی حصے کی تخریب یا اسے گرانے کی سزا موت ہوگی۔ لیکن پادری "اوپر" جاکر بادشاہ (چارلس پنجم) سے اجازت نامہ لے آئے۔ (پادریوں نے یہی کہا ہوگا کہ ہم موروں کی چھوڑی ہوئی ایک مسجد میں گرجا بنانا چاہتے ہیں، مگر ٹاؤن کونسل ہمیں روک رہی ہے) یہ ایک مذہبی معاملہ تھا۔ بادشاہ نے موقع دیکھے بغیر اجازت دے دی، توڑ پھوڑ اور انہدام پھر جاری ہو گیا۔

تقریباً ایک سال بعد بادشاہ اشبیلیہ جاتے ہوئے قرطبہ سے گزرا تو اسے زندگی میں پہلی بار مسجد دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ (بعض روایات کے مطابق وہ گرجا دیکھنے یا اس کا افتتاح کرنے آیا تھا۔) اسے یہ سب کچھ دیکھ کر شدید صدمہ ہوا اور غصہ بھی آیا۔ اس نے مسجد ڈھانے والوں کے وحشیانہ پن کی مذمت کی اور کہا: "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ مسجد ایسی نادر الوجود چیز ہے تو میں اس میں کسی تبدیلی کی ہرگز اجازت نہ دیتا۔" پھر اس نے براہِ راست پادریوں کو مخاطب کیا:

You have destroyed something irreplaceable with a church, one can find everything.

(تم نے ایک ایسی [نادر الوجود] شے برباد کر ڈالی ہے، جس کا بدل ممکن نہیں۔ اس کی جگہ گرجا تعمیر کیا ہے۔ ایسے گرجے تو ہر جگہ مل جاتے ہیں۔

ایک اور کتاب میں یہ الفاظ ملتے ہیں: You have undone what is unique in the world. (تم نے ایک منفرد اور بے مثال شے توڑ پھوڑ دی ہے)۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے بقول: "مسجد قرطبہ ایک جلیل القدر قوم کی جفاکشی، جاں بازی، مہم جوئی، اور بلند خیالی کی زندہ تصویر ہے"۔ (روح اقبال: ص ۱۰۷)

یہ ذکر تو آچکا ہے کہ علامہ نے شیخ محمد اکرام کے نام ایک خط میں لکھا: "مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایک ایسی رفعت تک پہنچا دیا، جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی"۔ ایک اور موقع پر کسی نے علامہ اقبال سے پوچھا کہ مسجد کو دیکھ کر آپ پر کیا اثر ہوا تھا؟ آپ نے کہا: It is a commentary on the Quran, written in stones.، یہ قرآن پاک کی ایسی تفسیر ہے جو پتھروں کے ذریعے لکھی گئی ہے۔ (مقالات یوسف سلیم چشتی: ص ۳۶)

علامّہ اقبال ایک پختہ فکر شاعر اور فلسفی تھے اوراس وقت ان کی عمر ۵۶ سال تھی۔ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اس عمر میں وہ جذبات کی رو میں بہ گئے ہوں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ مسجد کا جلال و جمال ہی اس قدر متاثر کرنے والا اور مرعوب کن تھا کہ اس نے اقبال کے جذبات میں ہل چل مچادی۔ مسجد دیکھ کر واپس آئے تو قرطبہ ہی سے غلام رسول مہر کو لکھا: ”مرنے سے پہلے قرطبہ ضرور دیکھو“۔ (گفتار اقبال: ص ۱۶۵)۔ اسی طرح بیٹے جاوید اقبال کے نام خط میں لکھتے ہیں: ”میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ میں اس مسجد کے دیکھنے کے لیے زندہ رہا۔ یہ مسجد ‘ دنیا کی تمام مساجد سے بہتر ہے۔ خدا کرے تم جوان ہو کر اس عمارت کے انوار سے اپنی آنکھیں روشن کرو“۔ (گفتارِ اقبال: ص ۱۶۵)

خوش قسمتی سے راقم الحروف کو نومبر ۱۹۹۱ء میں مسجد قرطبہ کی زیارت کا موقع ملا۔ اب یہ سرکاری محکمہ ٔآثارِ قدیمہ کی تحویل میں ہے۔ مسجد کے بیشتر دروازے مستقلاً بند رہتے تھے۔ ہم ۴۰۰ پسی تے (تقریباً ایک سو روپے) کا ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوئے۔ میں نے زیارتِ مسجد کی جو روداد قلم بند کی تھی‘ اس کا ایک حصہ ذیل میں درج کرتا ہوں:

”چند ہی قدم آگے بڑھے تو ستونوں اور محرابوں کا ایک جنگل اچانک سامنے آگیا۔ ایک ایسا سلسلہ جو دور تک چلا گیا تھا، جیسے لامتناہی ہو۔ یہ ایک ٹھٹکا دینے والا منظر تھا۔

میرے قدم رک گئے۔ یہ منظر مرعوب و مبہوت کر دینے والا تھا اور اس نے مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ مسجد کے جلال و شکوہ سے ہیبت اور رعب کا احساس ہو رہا تھا۔ اس میں خوف کا عنصر نہ تھا‘ بلکہ یہ اس تعجب پر مبنی تھا جو کسی نئی‘ انتہائی انوکھی‘ منفرد‘ نادر و نایاب اور یگانہ و بے مثال شے کو دیکھ کر انسان پر طاری ہوتا ہے اور انسان سوچتا ہے کہ کیا روے زمین پر اور اس کائنات میں یہ کچھ بھی موجود ہے۔

چند لمحوں کے بعد ہم آگے بڑھے۔ ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اگرچہ یہاں مسجد کی روایتی روشن فضا ناپید تھی اور نیم روشن‘ نیم تاریک ماحول میں ایک الجھن اور ایک گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی تاہم قطار اندر قطار ستونوں اور ان کے اوپر سلسلہ در سلسلہ محرابوں کا دل کش نظارہ دامن دل کھینچ رہا تھا۔ اولین تاثر میں جلال و شکوہ غالب تھا‘ اب آہستہ آہستہ جمال و زیبائی کا کرشمہ ظاہر ہونے لگا تھا۔ ذہن بے اختیار اقبال کے اشعار کی طرف منتقل ہو گیا:

تیرا جلال و جمال‘ مردِ خدا کی دلیل

وہ بھی جلیل و جمیل‘ تو بھی جلیل و جمیل

تیری بنا پایدار‘ تیرے ستوں بے شمار

شام کے صحرا میں ہو‘ جیسے ہجوم نخیل

اس قدر کامل مشابہت!... مسجد اور اس کے بنانے والوں کے ساتھ ساتھ اقبال کی شاعری اور فن کی عظمت کا احساس تازہ ہو گیا۔

ستونوں کے درمیان سے آگے بڑھتے ہوئے، معلوم ہو رہا تھا جیسے ہم کھجوروں کے کسی مسقف باغ میں گھوم رہے ہیں۔ ہمارا رخ، الحکم ثانی کے توسیع کردہ حصے میں واقع محراب کی طرف تھا۔ سر گھما کر دائیں دیکھتے، کبھی بائیں، کبھی اونچی محرابی چھتوں پر نظر ڈالتے۔ بعض حصوں کی چھتیں منقش لکڑی کی تھیں۔ خنکی اور ایک ناگوار باس کا احساس بدستور دامن گیر رہا۔ ستونوں کے اوپر چھت تک محراب در محراب کا سلسلہ، صنّاعی اور فن تعمیر کا ایک انوکھا مظاہرہ تھا۔ ستون انتہائی ٹھوس اور قیمتی پتھر کے تھے اور مسجد کے مختلف حصوں میں ان کی رنگت جدا جدا تھی۔ محرابوں کے نمونے بھی مختلف تھے۔ وسط میں پہنچے تو کلیسائے کبیر نے راستہ روکا۔ خیر، ہم اس سے پہلو بچاتے ہوئے آگے بڑھے۔ پھر وہی باغ نخیل کا منظر... ستون قطار اندر قطار اور ستونوں کے اوپر محراب بر محراب... مسجد کی اصل اور مرکزی محراب بھی نظر آنے لگی۔ مگر ابھی وہ کچھ فاصلے پر تھی۔ ماحول کے سحر نے پھر ہمارے قدم روک لیے۔ ایک حصے کو دیکھتے، کبھی دوسرے حصے کی طرف نظر دوڑاتے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر حصے کی منقش چھت پر بھی نظر ڈالتے۔ بعض گنبدوں کے اندر بنی ہوئی محرابوں اور ان کے اطراف میں نقاشی و خطاطی اور پچی کاری کا کام اس باریک بینی و مہارت سے کیا گیا تھا کہ ایک ناظر کے لیے مبہوت ہوئے بغیر چارہ نہ تھا"۔

(پوشیدہ تری خاک میں، ص ۶۰۔۶۱)

☆ نظریۂ مردِ مومن:

مسجد قرطبہ اور مردِ مومن میں جلال و جمال کی صفات مشترک ہیں۔ چنانچہ اقبال کا سلسلۂ خیال مسجد سے مردِ مومن کی طرف مڑ جاتا ہے۔ یہاں اقبال نے پہلے تو قرونِ اولیٰ کے ان مسلمانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ جو اقبال کے مثالی مردِ مومن کا نمونہ تھے۔ ان مسلمانوں نے اپنی اولوالعزمی، شجاعت اور بلند کرداری کی بدولت ایک دنیا کو مسخر کر کے مظلوم انسانیت کو امن و محبت اور خوش حالی کا پیغام دیا تھا۔ ان مسلمانوں نے اندلس میں علوم و فنون کو حیرت انگیز انداز میں ترقی عطا کی اور تمدن کی کایا پلٹ دی، حتیٰ کہ یورپ مختلف علوم و فنون میں مسلمانوں سے اکتساب کرنے لگا۔

اور پھر اقبال اپنے مثالی مردِ مومن یا مردِ کامل کی صفات کی طرف متوجّہ ہوتے ہیں۔ پانچواں بند تمام تر اقبال کے نظریۂ مردِ مومن کی وضاحت پر مشتمل ہے۔ "تجھ پر ہوا آشکار" کہہ کر اقبال نے سلسلۂ کلام میں بندۂ مومن کے تصوّر کو مسجد قرطبہ سے از سرِ نو مربوط کر دیا ہے۔ اس طرح "مسجد قرطبہ" میں مردِ مومن کے بیان کے دو حصے ہیں:

ا۔ پہلے حصے میں (جو پانچویں بند کے پہلے دو شعروں اور چھٹے بند کے صرف دوسرے شعر پر مشتمل ہے) بندۂ مومن کی عظمت کا اعتراف مسجد قرطبہ کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ مسجد کی بلندی، وسعت، خوب صورتی، روشنی، اور رعنائی ہی سے مومن کے جلال و جمال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ گویا اس کی شخصیت، مسجد کی صورت میں منعکس ہے۔

دوسرے حصے میں (پانچویں بند کا بقیہ حصہ) مرد مومن کی بعض صفات اور اس کے کردار کے ایسے پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے، جن کا تذکرہ قرآن و حدیث اور اسلامی تاریخ میں ملتا ہے۔ اقبالؒ کا تصوّر مرد مومن ایک خالصتاً اسلامی نظریہ ہے، جس کی اساس قرآن و حدیث ہے اور یہ کہ نیٹشے کا مافوق الفطرت انسان یا الجیلی کا مردِ کامل اقبال کے مردِ مومن سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔

☆مسلم ہسپانیہ کی عظمت و شکوہ:

مرد مومن اور مسجد قرطبہ، عظمت و رفعت میں ایک دوسرے سے کم نہیں، اس لیے چھٹے بند کے پہلے دو شعروں میں اقبال نے ایک طرف "کعبۂ ارباب فن، سطوتِ دینِ مبیں" کہہ کر مسجد کی عظمت کو خراج تحسین پیش کیا اور دوسری طرف قلبِ مسلمان کو اس کی نظیر بنا کر مرد مومن کو جلال و جمال میں مسجد کے برابر درجہ عطا کیا ہے۔ لیکن نظم کے اس حصے میں شاعر کا سلسلۂ خیال اندلس کی حرم مرتبت زمین کی طرف مڑ گیا ہے۔ اقبالؔ نے چھٹے بند میں مسلم ہسپانیہ کی عظمت و شکوہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ حصہ دراصل اقبال کے اس مصرع :

مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

کی تشریح ہے اور اس کا بیان تین پہلوؤں سے ہوا ہے۔

سب سے پہلے "حرم مرتبت اندلس" کے باسیوں اور عربی شہ سواروں اور "مردان حق" کا ذکر ہوا ہے۔ جو "حامل خلق عظیم" اور "صاحب صدق و یقیں" تھے۔ اندلس کی سرزمیں پر قدم رکھنے والا مسلمانوں کا سب سے پہلا گروہ عربی النسل لوگوں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ اپنے اخلاق و کردار اور ذاتی اوصاف کے اعتبار سے صحیح معنوں میں مسلمانوں کی نمایندگی کرتے تھے۔

مسلمانوں کے سپہ سالار طارق ابن زیاد نے ساحل اندلس پر اترتے ہی کشتیوں کو جلا دیا۔ یہ اولین اقدام ہی اس قدر حیران کن اور بظاہر "احمقانہ" تھا کہ صاحبان صدق و یقین کے سوا کوئی اور ایسا اقدام نہیں اٹھا سکتا تھا اور کسی دوسرے گروہ کو جسے صدق و یقین کا عرفان حاصل نہ ہو، ایسے اقدام کی کوئی توجیہ سمجھ بھی نہیں آسکتی۔ نظم "طارق کی دعا" میں اقبال نے ان "پر اسرار بندوں" کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی ہے جو ذوق و شوق سے متصف تھے۔

پھر جو لوگ ان غازیوں کے وارث بنے، وہ حکمرانی کو اپنے لیے شاہی نہیں، فقر سمجھتے تھے۔ سپین کے مسلم حکمرانوں سے بہت سی قابلِ اعتراض حرکات بھی سرزد ہوئیں، لیکن بحیثیت مجموعی ان کا کردار اپنے دشمنوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ باعظمت اور بلند تھا۔ خصوصاً مسجد قرطبہ کی تعمیر میں حصہ لینے والے حکمرانوں کے کردار میں ہمیں "خلقِ عظیم" کی بڑی روشن مثالیں ملتی ہیں۔ مسجد قرطبہ کی بنیاد عبدالرحمن الداخل نے رکھی۔ وہ جلاوطنی میں بے سروسامانی کے عالم میں وطن سے نکلا اور خانہ بدوش کی حیثیت سے صحراؤں اور بیابانوں کی خاک چھانتا پھرا۔ اس کے لیے اپنی جان بچانا مشکل ہو رہا تھا، خطرات اور مشکلات

چاروں طرف سے یورش کر رہے تھے۔ مگر اس نے پے در پے آزمایشوں کے باوجود کبھی حوصلہ نہ ہارا۔ آخر کار ایک عظیم الشان ملک کا حکمران بنا:

صبح غربت میں اور چمکا
ٹوٹا ہوا شام کا ستارا

دشمن بھی اس کی دلیری و شجاعت، اولوالعزمی، عقل و فہم اور حکمت و تدبر کے معترف تھے۔ مؤرخین لکھتے ہیں: ایک بار خلیفہ المنصور کے دربار میں ذکر چھڑا کہ کون شخص "صقرِ قریش" (قریش کا شاہین) خطاب کا مستحق ہے۔ خلیفہ کو امید تھی کہ لوگ اس کا نام لیں گے، مگر درباریوں نے کہا: انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو اس کا مستحق عبدالرحمن الدّاخل (اول) ہے۔

مسجد قرطبہ کی تعمیر و توسیع میں عبدالرحمن کے بیٹے ہشام کا بھی اہم حصہ ہے۔ وہ ایک عدل پرور، سخی اور سادگی پسند حکمران تھا۔ پر تکلف اور ریشمی لباس سے اسے نفرت تھی۔ جاہ و حشمت اور نام و نمود سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ حاجت مندوں کی حاجت روائی اور فریادیوں کی دادرسی کو مقدم جانتا تھا۔ ایک بار اپنے محل میں اضافے کی خاطر وہ زمین کا ایک ٹکڑا خریدنا چاہتا تھا۔ زمین کے مالک سے گفتگو کے دوران پتا چلا کہ ان کا ہمسایہ بھی اسی مکان کے خریدنے کی نیت رکھتا ہے مگر بادشاہ کی وجہ سے خاموش ہے۔ ہشام نے مکان کی خریداری کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے دور میں ظلم و ستم کا خاتمہ ہو گیا۔ اور ہر طرف خوش حالی اور بے فکری کا دور دورہ ہو گیا۔ مؤرخ علامّہ مقری کا خیال ہے کہ ہشام اپنی عادات و اطوار کے لحاظ سے کسی طرح بھی عمر بن عبدالعزیز سے کم نہ تھا۔ نجی زندگی میں بھی متقی، عبادت گزار اور شریعت اسلامی کا سختی سے پابند تھا۔

مسجد میں آخری توسیع اور تکمیل ابن ابی عامر المنصور کے ہاتھوں انجام پائی۔ یہ وہ شخص تھا جس کے جامع کمالات ہونے پر مؤرخ متفق ہیں۔ اس نے اپنے ۲۶ سالہ دورِ وزارت میں کم و بیش ۵۶ لڑائیاں لڑیں اور کبھی شکست نہیں کھائی۔ دشمن عیسائی اس کا نام سن کر ہی کانپنے لگتے تھے۔ علما، شاعروں اور ادیبوں کا بے حد قدر دان تھا۔ اس کی فیاضی اور عدل و انصاف کی بے شمار داستانیں مشہور ہیں۔ رات کو گشت کے ذریعے عوام کے حالات معلوم کرتا اور ان کی دادرسی کرتا۔ اس نے بہت سی نئی عمارتیں، پل اور مساجد تعمیر کرائیں۔ جہاد کرتے ہوئے ہمیشہ اس نے شہادت کی آرزو کی مگر پوری نہ ہو سکی۔ اس کی موت ایک عظیم المرتبت، باحوصلہ اور جری شخصیت کی موت تھی۔

یہ ان "عربی شہ سواروں" میں سے چند ایک کا ذکر ہے جو طارق کے صحرا نشینوں کے وارث اور اقبال کے صاحبان صدق و صفا تھے اور ان کے کردار میں "خلقِ عظیم" کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

نظم "ہسپانیہ" میں بھی اقبال نے انھی کے بارے میں کہا:

روشن تھیں ستاروں کی طرح ان کی سنانیں
خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں

یہ لوگ مسلم ہسپانیہ کی عظمت کے امین اور اس کے زندہ نشانات تھے۔

۲۔ پھر یہی لوگ تھے جنھوں نے مشرق و مغرب خصوصاً یورپ کو علم و فضل سے روشناس کرایا اور تمدنی آداب سکھائے۔ ہسپانیہ کا مسلم دورِ حکومت، حکمت و روشنی کا ایک ایسا مینار تھا جس سے یورپ نے اپنی تاریکیوں کو منور کیا۔ یورپ پر اندلسی مسلمانوں کے احسانات سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ یورپ نے کانٹے، چھری، نیپکن اور چمچوں کے استعمال سے لے کر طب، جراحی، ریاضی، تاریخ اور جغرافیے جیسے علوم و فنون تک ہسپانیہ کے مسلمانوں سے ہی سیکھے۔ مؤرخ لیبان مسلمانوں کے اعلیٰ طبیب اور جراح ہونے کا معترف ہے۔ اندلس کے معروف سرجن ابوالقاسم نے فن جراحی پر ایک یادگار کتاب لکھی تھی۔ یورپ کے عیسائی، اسپین کی مسلم درس گاہوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفوں پر آیا کرتے تھے۔ مؤرخ ڈوزی کا بیان ہے کہ حکم کے زمانے میں اندلس میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو لکھ پڑھ نہ سکتا ہو جبکہ یورپ میں ایک خاص طبقے کے چند لوگوں کے سوا عام آدمی ان پڑھ تھے۔ قرطبہ یونی ورسٹی علوم و فنون کے مختلف شعبوں اور تعلیم کے بلند معیار کے سبب دنیا بھر میں مشہور تھی۔

موجودہ انگریزی ہندسوں، چینی اور شیشے کے ظروف، انگریزی بالوں، ٹیڑھی مانگ، سنگار اور بعض خوشبویات تک کے لیے یورپ ہسپانیہ کا مرہون منت ہے۔ شہروں کی صفائی، پانی کی بہم رسانی کے لیے موزوں انتظام، مکانات کی کشادگی اور ہوا کی ضرورت، سڑکوں کی چوڑائی اور روشن دانوں کی اہمیت، غرض مدنی احساس (Civic Sense) کا سرچشمہ اور منبع بھی اندلسی مسلمان ہیں۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ شمالی سپین کی عیسائی ریاستیں اگر کوئی مسلم علاقہ فتح کر لیتیں تو وہاں کے عیسائی باشندے ان کے حق میں بد دعا کرتے تھے اور یہ آس لگا کر بیٹھ جاتے تھے کہ کب خدا ان ظالموں کے ہاتھ سے نجات دے کر پھر مسلمانوں کو حکمران بناتا ہے جن کے زیر سایہ ان کی آزادی، جان و مال، عزت و آبرو اور ان کی خانقاہیں اور گرجے محفوظ تھے۔ ان سے معمولی سا ٹیکس لیا جاتا تھا اور وہ سکھ چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں پیرس میں اقبال کی ملاقات فرانس کے عالم میسی نون سے ہوئی۔ وہ شخص مسلمانوں کے زمانۂ اسپین پر تحقیق کر رہا تھا۔ اس نے دوران ملاقات میں، اقبال کے سامنے اعتراف کیا کہ یورپ پر مسلمانوں کے عظیم احسانات ہیں۔ انھوں نے تہذیبی اعتبار سے یورپ کو بیدار کیا اور تعلیم و معاشرت کے بہت سے شعبوں میں مغرب کی ترقی کے لیے نئے نئے مواقع عطا کیے۔

ہسپانیہ پر مسلمانوں کے دورِ حکومت کے تہذیبی و تمدنی اثرات اس قدر دور رس، ہمہ پہلو اور گہرے تھے کہ صدیوں بعد آج بھی، جب عیسائیوں نے کسی ایک مسلمان کو بھی زندہ نہیں چھوڑا، قتل کر دیا یا پھر عیسائی بنا لیا اور مسلمانوں کے آثار و نشانات کو منہدم کر دیا، اسپین میں مسلم تمدن کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسپین کے موجودہ باشندوں کی خوش دلی، سادگی، اور گرم جوشی نسلی اثرات کا نتیجہ ہے۔ اسپین اور اس کے باشندوں میں اقبال کو بعض ایسی خصوصیات نظر آئیں جن کا تعلق حجاز و یمن سے ہے اور جنھیں دیکھ کر بے اختیار سپین کا مسلم دورِ حکومت یاد آ جاتا ہے۔

☆اندلس میں احیاے اسلامی' اہمیت و امکانات:

تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے کسی بھی مسلمان کے لیے اپنے دل کو ہسپانیہ میں احیاے اسلامی کی تمنا سے بچانا بہت مشکل ہے۔ خصوصاً اقبال جیسے دردمند مسلمان کے لیے جب وہ مسجد قرطبہ کے ایوانوں میں گھوم رہا ہو اور دریاے وادی الکبیر اپنی موجوں میں صدیوں پرانی ماضی کی پر شکوہ داستانیں سمیٹے، نگاہوں کے سامنے بہ رہا ہو' شاعر کے گوشۂ دل میں احیاے اسلامی کے جذبات کا جنم لینا کچھ عجب نہیں۔ اسی کیفیت کے تحت شاعر کا یہ سلسلۂ خیال اندلس میں احیاے اسلامی کی طرف مڑ جاتا ہے۔ یورپ کے متعدد انقلابات کی تاریخ اقبال کے ذہن میں تازہ ہے' وہ اس پس منظر کے ساتھ ہسپانیہ میں احیاے اسلامی کے امکانات پر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ یہ سلسلۂ خیال نظم کے آخری دو بندوں میں جاری ہے۔

سلسلۂ خیال کے اس مرحلے پر خطاب کا رخ مسجد قرطبہ (جو نظم کا اصل اور مرکزی موضوع ہے) کی طرف ہے۔ پہلے دو شعر شدید فکر و اضطراب اور بے مثال حسرت بھری تمنا کا مرقع ہیں۔ ہسپانیہ کی صدیوں سے بے اذان فضا کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کا جگر کٹ رہا ہے' دل الم سے کباب ہے' احیاے اسلامی کی تمنا ایک سوال کا روپ دھار لیتی ہے:

کون سی وادی میں ہے؟ کون سی منزل میں ہے؟
عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

اس شعر سے احیاے اسلامی کے لیے شاعر کی بے چینی' فکرمندی اور اس کا اضطراب ٹپکا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی وہ تجدید و احیا کے امکانات کا اندازہ لگا رہا ہے اور ان امکانات پر غور کرتے ہوئے یورپ کے مختلف انقلابات اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ علامہ اقبال سمجھتے ہیں کہ اگر جرمنی میں پادری مارٹن لوتھر کی اصلاح مذہب کی تحریک (Reformation) کامیاب ہو سکتی ہے[۱]' انقلاب فرانس (۱۴ جولائی ۱۷۸۹ئ) فرانسیسیوں کی کایا پلٹ سکتا ہے اور اٹلی کو مسولینی کی قیادت[۲] میں عظمت و برتری حاصل ہو سکتی ہے تو پھر ملت اسلامیہ کی نشأت ثانیہ بھی ممکن ہے۔ اس کے بعد وہ تجدید و احیا کے امکانات کی عملی صورت بھی بتاتے ہیں۔ یہ عملی صورت اقبال کے طویل غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

تقریب یہ ہے کہ اقبال دریاے وادی الکبیر کے کنارے کھڑے ہیں' احیاے اسلامی کی فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں' غروب آفتاب کا وقت قریب ہے' کوئی دیہاتی لڑکی گیت گاتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا گیت پر تاثیر اور آواز پر سوز ہے:

سادہ و پر سوز ہے دختر دہقاں کا گیت
کشتیِ دل کے لیے سیل ہے عہد شباب

یہاں اس شعر کی حیثیت' ایک طرح کے جملۂ معترضہ کی ہے۔ ضمناً یہاں یہ بتانا مناسب ہو گا کہ مذکورہ بالا اور ماقبل شعر پڑھتے ہوئے ذہن میں ولیم ورڈزورتھ کی نظم Solitary Reaper تازہ ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کی عظمت و شوکت' ان کا عبرت ناک زوال' یورپ پر مسلمانوں کے احسانات اور یورپ کی احسان فراموشیاں۔ ان سب چیزوں کی یاد اقبال کے قلب و ذہن کو

جذبات کا محشرستان بنائے ہوئے ہے۔ بہر حال وہ مسلمانوں کے روشن مستقبل سے مایوس نہیں... دریاے وادی الکبیر کے کنارے کھڑے ہو کر' وہ ہسپانیہ میں ایک بار پھر احیاے اسلامی کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ مگر ان کے خیال میں خواب کی تعبیر اسی وقت سامنے آسکتی ہے جب مسلمان زمانے کے میزان میں اپنے اعمال کا حساب کریں اور کشمکشِ حیات میں اپنے آپ کو اپنے مطلوبہ مرتبے و مقام کا اہل ثابت کریں۔ مولوی شمس تبریز خاں لکھتے ہیں: ''اقبال کا اس نظم میں سب سے بڑا فنی کمال یہ ہے کہ موضوع اگرچہ یاس انگیز و حسرت خیز اور یکسر قنوطی تھا لیکن اقبال نے اسے پورے طور پر رجائی انداز سے ٹچ (Touch) کیا ہے اور ان کا طرز استدلال (approach) مکمل طور سے خوش آیند و بشارت آمیز ہے''۔ (نقوش اقبال: ص ۱۸۳)

نظم کے آخری تین اشعار ان خیالات کی بازگشت ہیں جو نظم کے سب سے پہلے بند میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ نظم کے موضوعات و مطالب کا حاصل ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی فکر اقبال کا غالباً اہم ترین نکتہ بھی... کہ:

حیات جاوداں اندر ستیز است

مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا یہی راز تھا' مسجد قرطبہ کے جلال و جمال کی بنیاد بھی یہی ہے اور مسلم نشأت ثانیہ کے امکانات بھی اسی میں پوشیدہ ہیں۔

فنی تجزیہ

''مسجد قرطبہ'' ترکیب بند ہیئت کے آٹھ بندوں پر مشتمل ہے۔ بحر کا نام منسرح مثمن مطوی موقوف مکسوف ہے۔ اس کا وزن اور ارکان یہ ہیں:

مُفْتَعِلُنْ فَاعِلُنْ مُفْتَعِلُنْ فَاعِلَاتْ

دوسری طویل نظموں کے برعکس ''مسجد قرطبہ'' کی انفرادیت یہ ہے کہ اقبال نے اس نظم میں حسن ظاہری اور پابندیِ روش کی خاطر ہر بند کے اشعار کی تعداد برابر (سات سات) رکھی ہے۔

نظم کا موضوع جس قدر عظیم اور رفیع الشان ہے' اس کا فنی پیرایہ بھی اُسی قدر حسین و جمیل ہے۔ ''مسجد قرطبہ'' کا تقدس' اس کی رفعت و پاکیزگی اور جلال و جمال' اقبال کی اس نظم کی صورت میں مجسم ہو کر ہمارے سامنے آگیا ہے۔ اسے پڑھ کر قاری کے دل و دماغ پر مسجد قرطبہ کی شوکت و سطوت کا ایک نقش قائم ہوتا ہے۔ اور یہ نظم ایک ایسا معجزۂ فن معلوم ہوتی ہے جس کی تکمیل اقبال نے اپنے خون جگر کے ذریعے کی ہے۔

☆ ایجاز و بلاغت

''مسجد قرطبہ'' ۱۹۳۳ء میں لکھی گئی۔ یہ دور، اقبال کے فکر و فن کی پختگی کا دور ہے، چنانچہ نظم اقبال کے فن کا ایک عظیم الشان شاہ کار ہے۔ پوری نظم اور نظم کا ہر بند اور ہر بند کا ایک ایک شعر' ہر ہر مصرع اور ایک ایک ترکیب ایجاز و بلاغت اور جامعیّت

کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ اس نظم میں اقبال نے بہت سے اہم نظریات پر اظہارِ خیال کیا ہے' مثلاً: نظریۂ عشق' نظریۂ فن' مردِ کامل وغیرہ، مگر کمال فن یہ ہے کہ بڑے اختصار کے ساتھ گنے چنے الفاظ کے ذریعے متعلقہ موضوع کو اس کی پوری جزئیات و تفصیلات سمیت بیان کر دیا گیا ہے۔ کائنات کے ازلی و ابدی حقائق' دنیا کی تاریخی صداقتوں اور زندگی کے نفسیاتی مسائل کو اس بلیغ انداز میں بیان کیا ہے کہ کہیں پیچیدگی اور الجھن کا احساس نہیں ہوتا۔ چند مثالیں :

عشق دمِ جبرئیل' عشق دلِ مصطفی
عشق خدا کا رسول' عشق خدا کا کلام

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

تیرا جلال و جمال' مرد خدا کی دلیل

دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں

اسی طرح کعبۂ ارباب فن' حاملِ خلقِ عظیم' عصمتِ پیر کنشت' نقطۂ پرکارِ حق' اور قافلۂ سخت جاں جیسی ترکیبوں میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے۔

☆ تنوع:

موضوع اور لب و لہجہ' دونوں اعتبار سے ''مسجد قرطبہ'' میں تنوع پایا جاتا ہے۔ بظاہر نظم کا موضوع قرطبہ کی عالی شان جامع مسجد ہے مگر جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا' نظم میں اقبال نے بہت سے نظریات و موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے' مثلاً:

الف: نظریات زمان و مکاں' عشق' فن اور مردِ کامل

ب : مسجد قرطبہ کی عظمت و رفعت اور حسن و پاکیزگی

ج: یورپ کے بعض فکری اور سیاسی انقلابات

د : مسلم ہسپانیہ کی عظمت اور یورپ پر مسلم تمدن کے اثرات

ر: احیائے ملت اسلامیہ کے امکانات

شاعر نے ضمنی طور پر بعض چھوٹے اور نسبتاً غیر اہم موضوعات پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ نظم کا لب و لہجہ بھی متنوع ہے۔ نظم کے پہلے بند کا لہجہ فلسفیانہ ہے۔ وہ حصے جن میں شاعر نے مسجد قرطبہ کی عظمت، مسلمانوں کی شوکت رفتہ اور اسپین کے مسلم حکمرانوں کا ذکر کیا ہے، تأسّف، دردمندی اور سوز و گداز سے لبریز ہیں۔ جہاں مردِ مومن کی صفات اور عشق کی تخلیقی قوّت کا بیان ہوا ہے، وہاں شاعر نے ایک مفکر کا حکیمانہ لہجہ اختیار کیا ہے۔ آخری بند کے اس حصے میں، جہاں شاعر مستقبل کا خواب دیکھ رہا ہے، اس کا لہجہ قدرے پر جوش اور پیغمبرانہ ہے۔

☆ فارسیّت:

"مسجد قرطبہ" ۱۹۳۳ء کی یادگار ہے۔ ایک سال پہلے جاوید نامہ منظر عام پر آئی تھی۔ اس سے پہلے ۱۹۲۷ء میں زبور عجم شائع ہوئی تھی۔ گویا یہ وہ دور تھا جب اقبال اپنے افکار و خیالات کا اظہار زیادہ تر فارسی میں کر رہے تھے، اسی لیے "مسجد قرطبہ" پر فارسی کا اثر نمایاں ہے۔ اسی زمانے کی نظم "دعا" (ہے یہی میری نماز...) میں بھی فارسیت نمایاں ہے۔

اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے۔ "مسجد قرطبہ" کے بعض حصے مکمل فارسی میں ہیں، مثلاً :

سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ

سلسلۂ روز و شب، صیرفیِ کائنات

کعبۂ اربابِ فن، سطوتِ دینِ مبیں

ساقیِ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق

خوش دل و گرم اختلاط، سادہ و روشن جبیں

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات

اور بہت سے ایسے مصرعے بھی ہیں جن میں حرف، یا امدادی فعل یا ایک آدھ لفظ کے سوا پورا مصرع فارسی میں ہے، مثلاً :

سلسلۂ روز و شب، سازِ اول کی فغاں

تیرا منارِ بلند، جلوہ گہِ جبرئیل

عشقِ بلاخیز کا قافلہ سخت جاں

ملت رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر

روحِ امم کی حیات ،کشمکشِ انقلاب

☆عربی اثرات:

نظم کے اسلوب پر فارسی اثر کے باوجود ’’مسجد قرطبہ‘‘ کی فضا پر عربی شعر وادب کے اثرات غالب ہیں۔ ہسپانیہ کی فضا اور ماحول ایک لحاظ سے عربی تھا اس لیے نظم کا مزاج بھی عربی ہے۔ نظم کے بند، غزل کی صورت میں چلتے ہیں مگر ردیف موجود نہیں۔ یہ خصوصیت عربی شاعری کی ہے۔ مسجد کے ستون دیکھ کر اقبال کو صحرائے شام کے ’’ہجومِ نخیل‘‘ یاد آتے ہیں۔ اس کے بلند مینار ’’جلوہ گہِ جبریل‘‘ معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں اندلس کی ہواؤں میں آج بھی ’’بوئے یمن‘‘ محسوس ہوتی ہے اور اس کی نواؤں میں اب بھی ’’رنگِ حجاز جھلکتا ہے۔ ’’کاس الکرام‘‘ کی ترکیب ایک عرب شاعر کے اس شعر سے ماخوذ ہے :

شَرِبْنَاوَاَہرَ قْنَاعَلَی الْاَرْضِ جُرْعَۃً

وَلِلْاَرْضِ مِنْ کَاْسِ الْکِرَامِ نَصِیْبُ

اسی طرح ’’تیرا جلال و جمال، مرد خدا کی دلیل‘‘ کا مفہوم اندلس کے ایک حکمران عبد الرحمن الناصر کے ایک شعر میں ملتا ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ ’’کسی عمارت کا عالی شان ہونا اشارہ کرتا ہے اس امر کی جانب کہ اس کا بنانے والا عالی شان ہے‘‘۔

☆غنائیت:

’’مسجد قرطبہ‘‘ میں بعض اشعار اور مصرعوں میں مختلف تراکیب، الفاظ و حروف کی تکرار اور قوافی کے استعمال سے صوتی نغمگی اور خوش آہنگی پیدا ہو گئی ہے، مثلاً: ’’اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا‘‘ میں ’’فنا‘‘ کی تکرار... آخر اور ظاہر کے قافیے اور ان میں ’’ر‘‘ کی آواز سے یا :

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات

عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

شعر میں لفظ ’’حیات‘‘ کی تکرار اور ’’ر‘‘ کا صوتی آہنگ یا ’’رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت‘‘ میں ’’گ‘‘ کا اور ’’تار حریر دو رنگ‘‘ میں ’’ر‘‘ کا صوتی آہنگ۔ اسی طرح: ’’اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے عجیب‘‘ میں زمانے، اور

فسانے کے قافیے اور باقی الفاظ کی تکرار۔ اس ضمن میں جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں: ''اس نظم کا ہر بند غیر مردّف اشعار پر مشتمل ہے اور ٹیپ کا ہر شعر مردّف ہے۔ یہ محض اتفاق کی بات ہے یا التزام ہے جو شاعر کے نغمہ آشنا احساس نے برقرار رکھا ہے''۔

☆ دیگر محسنات نظم:

الف: تشبیہات و استعارات :

پروفیسر عابد علی عابد نے شمس العلما مولانا عبد الرحمن کے حوالے سے لکھا ہے کہ تشبیہ اور استعارہ اگر توضیح مطلب کا فریضہ ادا کرے تو کمالِ صنعت گری ہے۔ اقبال کے کلام میں اکثر و بیشتر تشبیہات و استعارات کے استعمال کا مقصد، محض آرایش کلام نہیں بلکہ توضیحِ معانی ہے۔ اقبال نے عشق کو دمِ جبرئیل، دلِ مصطفی، خدا کا رسول، خدا کا کلام، فقیہ حرم اور امیر جنود قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ استعارات صنعت گری کے عمدہ نمونے ہی نہیں بلکہ عشق کی اصلیت و حقیقت کو بھی بخوبی الم نشرح کرتے ہیں۔ ان استعارات کے ذریعے عشق کی ایسی وضاحت ہوتی ہے جو شاید کسی طویل تقریر یا مضمون سے بھی نہ ہو سکے۔

دوسرا قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ نظم کے پہلے بند میں اقبال نے سلسلۂ روز و شب کے لیے چند استعارے استعمال کیے ہیں، مثلاً: وہ نقش گر حادثات ہے، صیرفیِ کائنات ہے، سازِ ازل کی فغاں ہے، تارِ حریر دو رنگ ہے، زمانے کی رو ہے، وغیرہ۔ زمانہ ایک غیر مادّی اور تصوّراتی چیز ہے، مگر اقبال ان استعارت کے ذریعے زمانے کو ہمارے محسوساست و مشاہدات کے دائرے میں لے آئے ہیں۔ پروفیسر عابد علی عابد نے اسی پہلو کے بارے میں لکھا ہے: ''جب وہ [اقبال] دقیق تعقلات، باریک تصوّرات اور لطیف افکار و اسرار کی توضیح کرنا چاہتے ہیں تو ایسی ایسی خوب صورت تشبیہیں اور استعارے استعمال کرتے ہیں کہ ان دیکھی چیزیں، دیکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔'' (شعرِ اقبال: ص ۵۳۴)

مثلاً: ''عرشِ معلّٰی سے کم، سینۂ آدم نہیں'' بھی اسی طرح کی ایک عمدہ مثال ہے۔

ب: صنائع بدائع :

''مسجد قرطبہ'' میں صنعتیں اتنی خوبی اور خوب صورتی سے استعمال ہوئی ہیں کہ ان کا وجود بالکل فطری معلوم ہوتا ہے اور نظم میں کسی بناوٹ یا تصنع کا شائبہ بھی محسوس نہیں ہوتا۔ چند مثالیں :

ا: صنعت تلمیح:

دیکھ چکا المنی، شورشِ اصلاحِ دیں

چشم فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب

حاملِ ''خلقِ عظیم'' صاحبِ صدق و یقیں

ہاتھ ہے اللہ کا' بندۂ مومن کا ہاتھ

ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد' راہ بیں

۲۔ صنعت ترافق: (جس مصرع کو چاہیں' پہلے پڑھیں اور معنی میں کوئی فرق نہ آئے۔)

بوے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے

رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

عشق کے مضراب سے ہے نغمۂ تارِ حیات

عشق سے نورِ حیات' عشق سے نارِ حیات

۳۔ صنعتِ تجنیسِ لاحق: (دو متجانس الفاظ میں ایک ایسے حرف کا مختلف ہونا جو قریب المخرج ہو۔)

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو

رزم ہو یا بزم' پاک دل و پاک باز

۴۔ صنعت ردّ العجز علی الحشو :

آنی و فانی' تمام معجزہ ہاے ہنر

کارِ جہاں بے ثبات' کارِ جہاں بے ثبات

۵ : صنعت طباق ایجابی: (دو ایسے الفاظ کا استعمال جو معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہوں) :

اوّل و آخر فنا' باطن و ظاہر فنا!

نقشِ کہن ہو کہ نو' منزلِ آخر فنا!

ج: محاکات:

''مسجد قرطبہ'' کے بعض اشعار محاکات کی بہت عمدہ مثال ہیں، مثلاً:

تیری بنا پایدار' تیرے ستوں بے شمار

شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل

اس کی زمیں بے حدود، اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج، دجلہ و دینوب و نیل

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز

وادیِ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

☆ مجموعی قدر و قیمت:

جگن ناتھ آزاد نے اپنے ایک مضمون میں اقبال کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے ان کی شاعری کے ذکر کو غزل کے بجائے نظم پر ختم کیا ہے اور اس ضمن میں ''مسجد قرطبہ'' کے حوالے سے اقبال کے بے مثل اسلوب بیان اور نظم کی شعریت اور حسن و جمال کی بھرپور داد دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''یہ نظم صرف اقبال ہی کا شاہ کار نہیں بلکہ ساری اردو شاعری کا شاہ کار ہے۔ اردو شاعری میں اس نظم کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا تو بھی ہماری شاعری دنیا کی صف اول کی شاعری میں ایک ممتاز مقام حاصل کر سکتی تھی۔

''مسجد قرطبہ'' شعریت، رومانیت، حقیقت پسندی، رمزیت، اور ایمائیت کا ایک ایسا حسین امتزاج ہے کہ ہماری ساری اردو شاعری روزِ اوّل سے آج تک اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

''مجھے اپنی زندگی میں ۲۸۲۹۲۰ مربع فٹ کے رقبے میں بنی ہوئی اس عظیم الشان مسجد کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اور تصوّر میں اس مسجد کے جلال و جمال کا اندازہ کرنا آسان بھی نہیں ہے... اگر مجھے کبھی ہسپانیہ کی اس مسجد کو دیکھنے کا موقع ملے ۳؎ تو شاید میں اس وقت بھی یہ فیصلہ نہ کر سکوں کہ ہسپانیہ کی مسجد قرطبہ زیادہ جلیل و جمیل ہے یا بالِ جبریل کی ''مسجد قرطبہ۔''

(نگار پاکستان، اقبال نمبر ۱۹۶۲ئ: ص ۱۷۔۱۸)

اقبال کی اس بے مثال فنی تخلیق کی داد، اردو کے بیشتر نام ور نقادوں نے دی ہے، مثلاً: مولانا صلاح الدین احمد لکھتے ہیں: ''شاعر نے یہ نغمے غرناطہ کی عطر بیز فضاؤں اور وادی الکبیر کی کیف انگیز ہواؤں میں خود ڈوب کر لکھے ہیں۔ ''مسجد قرطبہ'' اقبال کی پختہ تر شاعری میں ایک امتیازی مقام رکھتی ہے اور اس کے بعض مقامات یقیناً دنیا کی عظیم ترین شاعری شمار کیے جا سکتے ہیں''۔

(تصوّراتِ اقبال: ص ۳۲۳)

ممتاز نقاد اور دانش ور سلیم احمد لکھتے ہیں: ''اقبال کی مسجد قرطبہ ایک ہندی کی طرف سے عرب مسلمانوں کے لیے عقیدت اور محبت کے ان جذبات کی تخلیق ہے جو ہندی مسلمانوں کے دل کو عربوں کے لیے ہمیشہ آغوش عاشق کی طرح کشادہ رکھتے ہیں... [اسے] ابدیت کی تاریخ میں ایک معجزۂ فن کا اضافہ'' قرار دیا جاسکتا ہے۔ (اقبال ایک شاعر: ص ۱۰۰، ۱۰۵)

مولوی شمس تبریز خان رقم طراز ہیں: اس نظم کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آفاق اور دائرۂ تخیل بہت ہمہ گیر اور محیط اور اس کا Canvas بہت وسیع اور اس کے پس منظر کا تاریخی شعور بہت طویل و عریض ہے اور تقریباً فتح اندلس سے لے کر زمانۂ حال تک کے تاریخی حوادث و انقلاب اور فکر و فلسفے کے اہم تحریکات کا ذکر آگیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اقبالؔ کا نظریۂ حیات و کائنات، ان کا فلسفۂ خودی، مرد مومن کا تخیل، ایمان و عشق کے بارے میں واضح تصوّرات، ان کا فلسفۂ تاریخ، ان کا نظریۂ شعر و ادب، فنون لطیفہ کے بارے میں ان کا طرز عمل، زندگی کے تخلیقی و تحریکی عناصر اور ان کے علاوہ بہت سے واضح نظریات اس نظم میں آگئے ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسجد قرطبہ کے آئینے میں، ہم اقبال کی ہشت پہلو شخصیت کے خدوخال دیکھ سکتے ہیں اور ان سے مل سکتے ہیں''۔ (نقوش اقبال: ص ۱۸۳-۱۸۴)

حواشی

۱۔ ۱۶ ویں صدی میں کلیسا ایک ایسا ادارہ بن چکا تھا جو مذہب کے نام پر ہر طرح کی جائز و ناجائز کارروائیاں کرنے کا عادی تھا۔ کلیسا عقل کا دشمن تھا اور کسی شخص کو اجازت نہیں تھی کہ وہ پوپ کی کسی بات پر اعتراض کر سکے۔ حتیٰ کہ پوپ نے نجات کے ایسے پروانے جاری کیے جو قیمتاً فروخت کیے جاتے تھے اور جن کے متعلق پوپ کا اعلان تھا کہ انھیں خریدنے والا جنتی ہو گا۔ یہ ایک طرح کی برہمنیت تھی جس کے خلاف سب سے پہلے جرمنی کے ایک عالم اور پادری ڈاکٹر مارٹن لوتھر نے علم احتجاج بلند کیا۔ عوام کے دلوں میں پاپائیت کے خلاف پہلے ہی نفرت موجود تھی، چنانچہ لوتھر کی تحریک بہت مقبول ہوئی اور پوپ کے مخالفین کا ایک مستقل فرقہ بن گیا جو پروٹسٹنٹ کہلانے لگے۔ عیسائی دنیا میں ان کی اکثریت ہے۔ پوپ کے پیروکار کیتھولک کہلاتے ہیں۔

۲۔ مسولینی ۱۸۸۳ء میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا۔ بڑے ہو کر اس نے اٹلی کی ترقی و عروج کے لیے ۱۹۱۹ء میں ایک تحریک چلائی جسے فاشزم کا نام دیا گیا۔ فاشسٹ قومی مفاد کے لیے ہر قسم کی فوجی کارروائیوں، تشدّد اور قوّت کے استعمال پر یقین رکھتے تھے۔ مسولینی پہلے اٹلی کا وزیر اعظم بنا پھر آمر مطلق۔ اس کی تحریک کے بہت سے منفی پہلو بھی تھے مگر اقبال فاشزم کی انقلابی روح سے متاثر تھے، جس کا اظہار انھوں نے بال جبریل کی نظم ''مسولینی'' میں کیا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں یورپ جاتے ہوئے انھوں نے اٹلی کی انقلابی تحریک کو خراج عقیدت پیش کیا :

ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو!

جہاز پر سے تمھیں سلام کرتے ہیں

مسولینی نے دوسری جنگِ عظیم میں ہٹلر کا ساتھ دیا مگر شکست کھا کر ۱۹۴۵ء میں خودکشی کر لی۔

۳۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو بعد ازاں ''مسجد قرطبہ'' اور اندلس میں مسلم دورِ حکمرانی کے دوسرے آثار دیکھنے کا متعدد بار موقع ملا۔

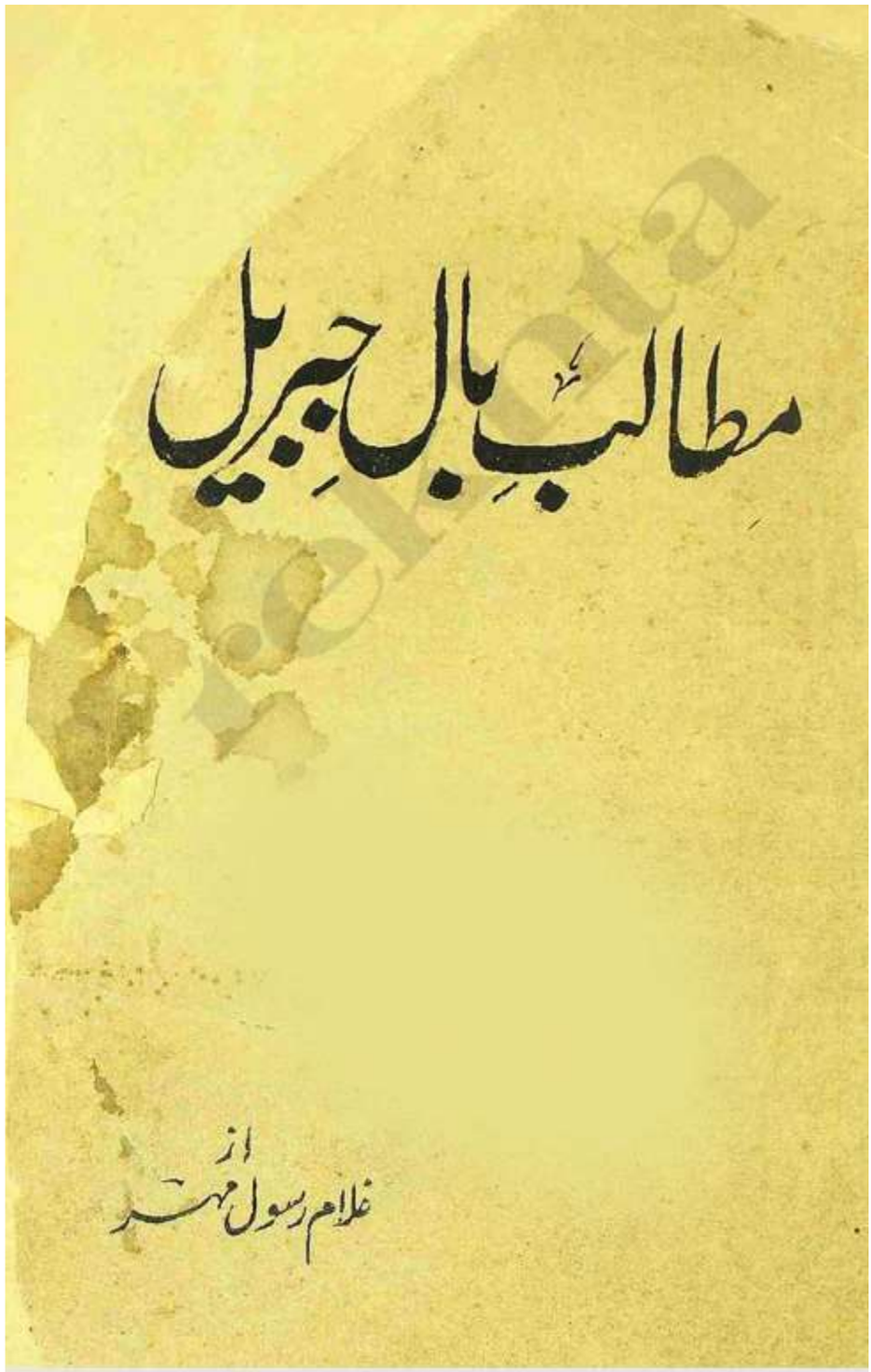

مسجد قرطبہ

یہ نظم بھی ہسپانیہ کی سرزمین، بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، یہ جامع قرطبہ کے متعلق ہے، جس کا پرانا جاہ و جلال گو باقی نہیں رہا لیکن وہ اب تک صفحۂ ہستی پر موجود ہے۔ اس کی بنیاد عبدالرحمن اوّل نے رکھی تھی، جو ہسپانیہ میں اموی سلطنت کا بانی تھا۔ پھر اس میں مختلف بادشاہ اضافے کرتے رہے۔ آخری اضافہ ابی عامر المنصور نے کیا تھا، جو اگرچہ وزیر اعظم تھا، لیکن اس نے مختار کل کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔

مسجد کا طول چھ سو بیس فٹ اور عرض چار سو چالیس فٹ تھا۔ دنیا کی کسی مسجد کا مسقّف حصّہ اتنا بڑا نہیں، جتنا کہ اس کا تھا۔ اس میں ایک ہزار چار سو سترہ ستون تھے، جن کی جلا کا یہ عالم تھا کہ انسان ان میں اپنا عکس دیکھ سکتا تھا۔ مسجد کی مختلف دیواروں میں اکیس دروازے تھے، جن پر پیتل کا بے حد خوب صورت کام کیا گیا تھا۔ اس کا مأذنہ ایک سو آٹھ فٹ بلند تھا۔ چوٹی پر چاندی اور سونے کے سیب نما گولے نصب کر دیئے گئے تھے۔ سورج کی شعاعیں ان پر پڑتی تو میلوں سے چمکتے ہوئے نظر آتے۔ روشنی کے لئے مسجد میں دو سو اسّی بلّوری جھاڑ آویزاں تھے۔ سب سے بڑے جھاڑ میں موم کی چودہ سو بتّیاں جلتی تھیں۔ ان کے علاوہ پیتل کے سات ہزار چار سو چھبیس

پیالے دیواروں سے لگے ہوئے تھے، جن میں تیل بتّی سے روشنی ہوتی تھی۔

شاہی مقصورہ کے تمام ستون لاجورد کے، دروازے چاندی اور سونے کے تھے۔ مسجد کا منبر آبنوس، صندل اور ہاتھی دانت کے چھتیس ہزار ٹکڑوں کو سنہری کیلوں سے جوڑ کر بنایا گیا تھا اور اس کی تیاری میں سات سال لگے تھے۔ غرض یہ مسجد اعجوبۂ روزگار تھی۔ اندلس کے بڑے بڑے علماء نے اسی میں تعلیم پائی تھی اور اسی میں وہ درس دیتے رہے تھے۔ اقبال نے اس کی عظمت زائل ہو جانے سے کم و بیش پانسو سال بعد اسے دیکھا اور جو اثرات قبول کئے، ان کا نقشہ نظم میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

حادثات: حادثہ کی جمع یعنی پیدا ہونے اور مرنے والی چیزیں۔

صیرفی: صرّافہ، پرکھنے والا۔

پہلا بند | (۱) رات اور دن کا سلسلہ یعنی زمانہ پیدا ہونے اور مرنے والی چیزوں کے نقش تیار کرتا ہے۔ رات اور دن کا سلسلہ ہی زندگی اور موت کی اصل ہے۔

مراد یہ ہے کہ زمان و مکان کے بغیر تغیرات کا تصوّر نہیں ہو سکتا اور تغیر کا مطلب ہے چیزوں کا پیدا ہونا اور ختم ہونا۔ بلکہ فلسفیوں کے نزدیک اس دنیا کے حادثے کی دلیل ہے کہ اس میں ہر چیز بدلتی رہتی ہے کوئی پیدا ہوتی ہے اور کوئی مرتی ہے۔ جو آج پیدا ہوتی ہے اور کل مرتی ہے بہر حال حادث ہے۔ اس کا تصوّر ہیں . . . . زمانے ہی میں ملتا ہے۔ لہٰذا زمانہ چیزوں کا پیدا کرنے والا اور مارنے والا ہے اور ہمارے تصوّرات کے مطابق یہی زندگی اور موت

کا سرچشمہ ہے۔ اگر ہم زمانہ کی حد سے باہر نکل جائیں تو موت و حیات کا یہ تصور بھی ختم ہو جائے۔

(۲) رات اور دن کا سلسلہ دو رنگے ریشم کا تار ہے، جس سے ذات باری تعالیٰ اپنے لئے صفات کا لباس تیار کرتی ہے۔

اس شعر میں شاعر نے رات اور دن کو ریشم کے دو تار قرار دیا۔ ایک سیاہ، دوسرا سفید یعنی رات اور دن وہ کپڑا ہے کہ ذات کو اس کی اصل صورت میں تو دیکھا نہیں جا سکتا جب وہ صفات کا لباس پہن لیتی ہے تو اس کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ خالق ہے، قادر ہے، پروردگار ہے، مالک ہے، حافظ ہے، ہادی ہے وغیرہ۔ یہ تصورات زمانے ہی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

(۳) رات اور دن کا سلسلہ وہ فریاد ہے جو ازل کے ساتھ سے پیدا ہوئی۔ اس سے ذات باری تعالیٰ کا مدعا یہ تھا کہ کائنات میں جو صلاحیتیں رکھی گئی ہیں، وہ زیر و بم کی شکل میں ظاہر ہو جائیں، یعنی روز و شب کا سلسلہ تخلیق کے ساتھ ہی شروع ہو گیا اور اسی میں انسان نے ممکنات کائنات کو روشنی میں لانا شروع کیا۔

مراد یہ ہے کہ کائنات کی صلاحیتیں زمانے ہی کے سلسلے میں ظاہر ہو سکتی تھیں۔ چونکہ اس شعر کے پہلے مصرع میں زمانے کو ساز ازل کی فغاں کہا گیا تھا اور ساز میں زیر و بم یعنی اونچے نیچے مدھم پنچم دونوں قسم کے سُر ہوتے ہیں۔ اس لئے ممکنات کے ساتھ زیر و بم استعمال کیا اور کائنات کی صلاحیتوں

میں بعض چیزیں بہت نمایاں ہوتی ہیں، بعض غیر نمایاں، لہٰذا زیر و بم کا استعمال بہت موزوں معلوم ہوتا ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ سازِ ازل کی نوا کے بجائے 'فغاں' کا لفظ کیوں استعمال کیا؟ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ شاعر کے نزدیک سازِ ازل کی جو آواز تخلیق کا باعث ہوئی، وہ روحوں کے لئے اصل سے مفارقت کا پیغام تھی۔

(۴) رات اور دن کا سلسلہ کائنات کا صرّاف ہے یعنی وہ ہر چیز کو پرکھتا ہے۔ کھوٹا کھرا الگ کر دیتا ہے، نہ میں اس امتحان سے آزاد ہوں، نہ تو اس امتحان سے آزاد ہے۔ زمانے کی کسوٹی سب کے لئے یکساں ہے۔

(۵) تو ہو یا میں، جو وجود بھی وزن اور خاصیت میں کم حیثیت ثابت ہو زمانہ اسے مٹا دیتا ہے اور اس کی قسمت میں موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

(۶) تیرے، رات اور دن کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ یہ زمانے کی ایک رو ہے اور زمانہ دن اور رات کی تمیز سے بے نیاز ہے۔ شاعر یہاں اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہے کہ زمانہ یا بہ الفاظ دیگر زندگی ایک مسلسل رو کا نام ہے جو کبھی بدلتی نہیں اور جس کا تسلسل کہیں ٹوٹتا نہیں۔ لہٰذا اس کے باب میں دن اور رات کی تمیز دراصل کوئی حقیقت نہیں رکھتی، جیسا کہ ایک جگہ فرمایا ہے:۔

تو سے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
ہے جواں، ہر دم رواں ہیہم دواں ہے زندگی

(۷) انسانی ہنرمندی نے جتنی حیرت انگیز چیزیں اب تک بنائیں، وہ سب تھوڑی دیر کے لئے ہیں اور جلد فنا ہو جانے والی ہیں۔ حق یہ ہے کہ اس دنیا کا

سارا سلسلہ ناپائدار ہے اور اس کی کسی شے کے لئے قیام اور قرار نہیں۔

(۸) اول و آخر بھی فنا ہے۔ ظاہر و باطن بھی فنا ہے۔ کوئی نقش نیا ہو یا پرانا، اس کی منزل فنا کے سوا کوئی نہیں۔

دوسرا بند | **تقویم**: جنتری، کلنڈر، وہ کتاب جس میں سال بھر کی تاریخوں وغیرہ کا نقشہ درج ہو۔ **عصر رواں**: وہ زمانہ جو جاری ہے۔ **پیکرِ گل**: مٹی کا جسم یعنی انسان۔ **صہبائے خام**: وہ شراب جس میں کوئی چیز نہ ملائی گئی ہو اور بالکل خالص ہو۔ بادہ نوشوں کا عام قاعدہ ہے کہ وہ شراب پیتے ہیں تو اس میں کوئی نہ کوئی چیز ملا لیتے ہیں، مثلاً گلاب کا عرق، سوڈا وغیرہ جس سے شراب کی تلخی اور تیزی کم ہو جاتی ہے، اگر اس میں کوئی چیز ملائی نہ جائے تو تلخی بھی زیادہ ہوتی ہے اور نشہ بھی زیادہ لاتی ہے۔ اسی کو صہبائے خام کہتے ہیں۔ **کاس الکرام**: کاس بمعنی پیالہ، کرام بمعنی سخی۔ کاس الکرام سے وہ پیالہ مراد ہے جس سے دوسروں کو بھی حصہ ملے۔ ممکن ہے کاس الکرام کی ترکیب استعمال کرتے وقت شاعر کے ذہن میں یہ شعر ہو:

(ہم شراب پی اور ایک جرعہ زمین پر بہا دیا۔ یقیناً سخی کے پیالے میں سے زمین کا حصہ ہے)

شراب نوشوں کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ پیتے ہیں تو تھوڑی سی بچی ہوئی شراب زمین پر گرا دیتے ہیں۔ **جنود**: جند کی جمع لشکر۔ **ابن السبیل**: مسافر۔

(۱) بے شک دنیا کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ مگر اس نقش میں ہمیشہ کی پائداری کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے، جو کسی مردِ حق کے ہاتھ سے مکمل ہو۔

مردِ حق یا مردِ خدا سے وہ انسان مراد ہے، جس کے تمام کام خدا کی رضا کے تابع ہوں۔

(۲) سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایسے نقش کو کیوں دائمی پائداری حاصل ہوتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ مردِ حق کا ہر کام عشقِ حق کی بدولت فروغ پاتا ہے۔ عشقِ حق زندگی کا جوہر اور روح ہے۔ اس پر موت وارد نہیں ہو سکتی اسے مٹا دینا موت کی دسترس سے باہر ہے۔

(۳) بلاشبہ زمانے کی رو بڑی ہی تیز و تند ہے اور اس کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہیں سکتی۔ وہ نئی نئی صورتیں پیدا کرتی اور مٹاتی رہتی ہے۔ اسے روکنا ممکن نہیں، لیکن عشقِ حق خود ایک تند سیل ہے۔ وہ زمانے کے سیل کو روک لیتا ہے یعنی عشق پر زمانے کا عمل جاری نہیں ہو سکتا۔

(۴) جس طرح ہمارے ہاں جنتریاں اور کلنڈر ہوتے ہیں اور ان میں دنوں اور مہینوں کے حساب درج کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح عشقِ حق کی بھی ایک جنتری ہے، جس میں زمانوں کے حساب لکھے جاتے ہیں۔ اس جنتری پر نظر رکھیں تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ اس میں اسی زمانے کا حساب درج نہیں جو جاری ہے اور جسے دنیا زمانہ کہتی ہے بلکہ اس میں اور زمانے بھی ہیں جن کا کوئی نام نہیں بتایا جا سکتا۔

مراد یہ ہے کہ جو زمانہ رات اور دن کے سلسلے سے بنتا ہے، اس کی خاصیت تو بے شک یہی ہے کہ وہ چیزوں کو بناتا اور مٹاتا رہتا ہے۔ اگر عشقِ حق کا معاملہ اسی زمانے تک محدود ہوتا تو وہ فنا کی دسترس سے باہر

نہ رہ سکتا۔ چونکہ اس کے ہاں اور زمانے بھی ہیں، لہٰذا وہ رات اور دن والے زمانے کے اثرات سے بالکل محفوظ ہے۔

(۵) دنیا میں پاکیزگی، طہارت، روحانیت اور برتری کے جتنے پاکیزہ اور نورانی نمونے نظر آتے ہیں، وہ سب عشق حق ہی کے مختلف جلوے ہیں۔ گویا عشق حق مختلف لباسوں، مختلف شکلوں اور مختلف پیکروں میں تجلّی ریز ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت جبریل امینؑ کا سانس اور ان کی آواز بھی عشق ہی کا ایک جلوہ تھا۔ حضرت سرور کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے قلب طاہر و اطہر کا نور بھی عشق حق کا ایک کرشمہ تھا۔ عشق ہی خدائے پاک کا ایلچی بن کر اس دنیا میں آیا اور انسانوں کو راہ حق پر لگایا۔ عشق ہی خدا کا کلام ہے، جس کی بدولت دلوں اور روحوں کے اندھیرے میں اجالا ہوتا ہے اور اخلاق کا بگڑا ہوا نقشہ اصلاح پاتا ہے۔

(۶) عشق حق ہی کی بدولت مٹی کے اس پتلے میں جسے انسان کہتے ہیں، آب و تاب پیدا ہوئی اور اس نے علم و عرفان اور ہدایت و سعادت کے وہ نمونے پیش کئے، جن کی روشنی کبھی ماند نہ پڑے گی۔ عشق خالص شراب ہے، جس کی تیزی اور تندی میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ عشق ان کرموں کا پیالہ ہے، جن کے فیض سے ہر شخص بہرہ یاب ہوتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ ان کے فیض کا دروازہ سب کے لئے کھلا ہوا ہے۔ وہ ہر ایک کو صحیح راستہ بتاتے ہیں، ہر ایک کی دست گیری کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اگر کوئی محروم رہ جائے تو یہ اس کی بدقسمتی ہے۔

(۷) عشقِ حق کبھی کعبہ کے اس پاک باطن عالم کی شکل اختیار کرتا ہے، جو شریعت کے نکتے سب کو سکھاتا ہے کبھی ان لشکروں کی سالاری کا فرض انجام دیتا ہے جو خدا کی راہ میں جہاد کے لئے تیار ہوئے ہوں۔ بغرض عشقِ حق کے ظہور کی بے شمار شکلیں ہیں یوں سمجھنا چاہئے کہ یہ ایک مسافر ہے جس کے ہزاروں مقام ہیں اور ان کا حساب مشکل ہے۔

(۸) محض عشقِ حق ہی کی مضراب ہے جو سازِ زندگی کے تاروں سے نغمے پیدا کرتی ہے اسی کی بدولت زندگی نورانی بنتی ہے اور اسی کی بدولت زندگی میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ عشقِ حق نہ ہوتا تو زندگی کے ساز سے کوئی نغمہ نہ نکل سکتا۔ یہ ساز بالکل بے نوا رہتا اور عشق ہی کے باعث زندگی میں جمالی اور جلالی شان پیدا ہوتی ہے۔

تیسرا بند | **رفت و بود**: بلفظی معنی گیا اور رہا، یعنی فنا۔ **چنگ**: ایک قسم کا باجا جو منہ سے بجایا جاتا ہے۔ **کشود**: کھلنا۔ **کفِ خاک**: خاک کی مٹھی، یعنی انسان۔ **سپہرِ کبود**: نیلا آسمان۔ **پیکرِ نوری**: نورانی وجود یعنی فرشتے اور قدوسی۔

(۱) اے قرطبہ کی مسجد! تو بھی عشقِ حق کی بدولت وجود میں آئی عشق سر سے پاؤں تک ہمیشگی ہے۔ اس کے لئے فنا نہیں۔

(۲) رنگ ہو یا اینٹ پتھر، ساز ہو یا لفظ و آواز، غرض کوئی فن ہو، اس کا کمال جگر کے خوں سے نمایاں ہوتا ہے۔

پہلے مصرع میں رنگ سے بظاہر مراد مصوری ہے، خشت و سنگ سے فنِ تعمیر، چنگ سے موسیقی، حرف و صوت سے شاعری، انشا اور خطابت۔ فرماتے ہیں کہ ان فنون میں اگر اخلاص و عشقِ حق کی نمائش ہو تو یقیناً یہ بڑے بلند پایہ فنون

بن جاتے ہیں اور قوموں کی تربیت میں بہت موثر ثابت ہوتے ہیں، لیکن اگر اخلاص و عشق حق موجود نہ ہوں تو یہ بے روح جسم ہوں گے اور چشم و گوش کی عارضی تواضع کے سوا کوئی وظیفہ انجام نہ دے سکیں گے۔ مسجد قرطبہ کو وہ خون جگر ہی کی بدولت معجزۂ فن قرار دیتے ہیں۔

(۳) خون جگر کا قطرہ پتھر کی سل کو دل کی طرح احساس اور تڑپ کا پیکر بنا دیتا ہے۔ جگر کے خون ہی سے آواز میں سوز، کیف اور نغمہ پیدا ہوتا ہے یعنی آواز خواہ شاعر کی ہو، خواہ داعی کی، خواہ کسی اور کی، وہ اسی وقت دلوں میں حرارت پیدا کرتی ہے اور روحوں کو عمل کے لئے بے خود بنا دیتی ہے، جب اس میں عشق کا جذبہ موجود ہو۔

(۴) مسجد سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تیری فضا دلوں کے لئے روشنی کا سامان ہے، میری نوا سے سینوں میں حرارت اور تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ تو دلوں کو حضور حق میں پہنچاتی ہے۔ میں دلوں کی پیچیدہ گتھیاں سلجھاتا ہوں اور ان میں انشراح پیدا کرتا ہوں۔

مراد یہ ہے کہ تیری فضا دلوں کو ہستی باری تعالیٰ کا یقین دلاتی ہے اور ان میں عبادت کا صحیح ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے، میرے نغموں سے دلوں میں عشق باری تعالیٰ کی آگ بھڑکتی ہے۔

(۵) انسان اگرچہ بظاہر بہت بے حقیقت معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا سینہ ایمان کے نور سے منور ہو جائے تو وہ عرش معلی سے کم نہیں رہتا۔ عرش معلی کی خصوصیت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ذات حق کی تجلیات کا خاص مرکز ہے۔

اگر انہیں تجلیات کا نزول نورِ ایمان کی وجہ سے انسان کے سینہ پر ہو تو اسے کیوں عرشِ معلیٰ سے کم سمجھا جائے! مانا کہ انسان اپنے جسمِ خاکی کے باعث نیلے آسمان سے آگے نہیں جا سکتا، لیکن اس سے اس کی معنوی برتری میں کوئی فرق نہیں آتا۔

(۶) عشقِ حق اور نورِ ایمان ہی کی بدولت انسان کا درجہ فرشتوں اور قدوسیوں سے بھی بلند ہو گیا وہ اگرچہ ذاتِ حق کو سجدے کرتے ہیں۔ اس کی تسبیح و تقدیس میں لگے رہتے ہیں جیسا کہ خود قرآن مجید سے ظاہر ہے: نحن نسبح بك ونقدس لك۔ لیکن انہیں سوز و گداز کا وہ مقام کہاں حاصل ہے؟ عشق میں تکلیفیں اٹھانے، مصیبتیں برداشت کرنے اور جلتے رہنے کی وہ سعادت کب نصیب ہوئی جو انسان کو حاصل ہے۔

(۷) میں ہندی کافر ہوں، یعنی مجھے ایمان کا وہ مقام حاصل نہیں جو اہلِ حق کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اے مسجد! میرے ذوق و شوق کی کیفیت دیکھ کہ یہاں پہنچتے ہی میرا دل بھی صلوٰۃ و درود میں مگن ہے اور میرے لب پر بھی صلوٰۃ و درود ہی کے ترانے جاری ہیں۔

(۸) میرا لب و لہجہ بھی شوق سے لبریز ہے۔ میری بانسری میں بھی شوق کے سوا کچھ نہیں اور میرے جسم کا ریشہ ریشہ اللہ ہو کا نغمہ گا رہا ہے۔

چوتھا بند | نخیل: کھجور کا درخت۔ ثغور: ثغر کی جمع، سرحدیں۔ دجلہ: عراق کا مشہور دریا جس کے کنارے بغداد واقع ہے۔ دینوب: وسطی یورپ کا مشہور دریا ڈینیوب جو جرمنی سے نکلتا ہے آسٹریا، ہنگری اور رومانیہ میں سے

گزرتا ہوا بحیرۂ اسود میں گرتا ہے۔ یورپ کے بعض مشہور شہر مثلاً وی آنا، بوڈا پسٹ اسی کے کنارے واقع ہیں۔ رحیل: کوچ۔ فارس: شہسوار۔ رحیق: خالص اور صاف شراب۔

(۱) اے مسجد قرطبہ! تیری شان و شوکت اور حسن و جمال کو دیکھ کر مرد خدا کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ وہ بھی اپنے اوصاف میں صاحب شان و شوکت اور صاحب حسن و جمال ہوتا ہے جس طرح تو ہے۔

(۲) تیری عمارت نہایت پختہ اور مضبوط ہے جس پر کم و بیش بارہ سو سال گزر چکے ہیں اور ابھی تک اپنی اصل حالت پر قائم ہے۔ تیرے ستون گنے نہیں جا سکتے، انہیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ملک شام کے جنگل میں کھجوروں کے درختوں کا جھنڈ ہو۔

1417

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ مسجد کے تمام ستون ایک ہزار چار سو ستر تھے انسان اتنے ستونوں کے درمیان کھڑا ہو جائے تو حیران رہ جاتا ہے اور ان کی گنتی نہیں کر سکتا۔ پھر ان ستونوں کے لئے تشبیہ نہایت پاکیزہ پیدا کی شام کا ذکر اس لئے بھی کیا کہ وہاں کھجوروں کے درخت بہت زیادہ ہوتے ہیں اور ان کی وضع اور ہیئت راستی میں ستونوں سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس لئے بھی کیا کہ مسجد کا بانی اور اس کے اخلاف شام سے نکل کر اندلس پہنچے تھے۔ اور وہاں انہوں نے عالی شان سلطنت قائم کی تھی۔ گویا اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسجد کی تعمیر کے دوران میں اپنے اصل وطن کا سب سے دل کش نظارہ ان کے سامنے رہا اور وہی نظارہ انہوں نے مسجد کی تعمیر میں پیدا کر دیا۔

(۳) تیرے دروازوں اور چھت پر وادیِ سینا کا نور جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔ تیرا وہ مینار جس پر اذان کہی جاتی تھی ایک سو اٹھاون فٹ بلند ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر حضرت جبریل امینؑ اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں۔

(۴) مسجد کی پائداری کا ذکر کرتے ہوئے اقبالؔ کے دل میں ملّت اسلامیہ کی پائداری تازہ ہو گئی۔ فرماتے ہیں کہ مسلمان کبھی نہیں مٹ سکتے اور کیوں مٹیں؟ ان کی اذانیں تو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ جیسے جلیل القدر پیغمبروں کے راز بے نقاب کر رہی ہیں۔ یعنی اسی دینِ حق کو دنیا میں پھیلانا مسلمان کا وظیفہ ہے جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ یا دوسرے پیغمبر اس دنیا میں لائے اور حضرت ابراہیمؑ سے دینِ اسلام کو جو خاص نسبت ہے، وہ کسی شرح کی محتاج نہیں۔

(۵) اسلامی وطن کی کوئی حد نہیں۔ روئے زمین کا ہر ٹکڑا اور ہر گوشہ مسلمان کا وطن ہے۔ اس کا افق حد بندی سے بے نیاز ہے۔ دریائے دجلہ، دریائے ڈینیوب اور دریائے نیل اس کے سمندر کی لہریں ہیں۔

مراد یہ ہے کہ مسلمان عرب سے نکلے تو ساری دنیا پر چھا گئے۔ کوئی گوشہ ایسا نہ رہا، جہاں ان کی تعلیماتِ حقّہ کے اثرات کسی نہ کسی شکل میں نہ پہنچے ہوں۔ دجلہ، ڈینیوب اور نیل کا ذکر تو سرسری طور پر کر دیا۔ ایشیا، یورپ اور افریقہ کا کون سا قابلِ ذکر دریا ہے جس نے اسلامی سمندر میں لہر کی حیثیت اختیار نہ کی ہو، بے شک آج ان کی وہ شانِ جلال باقی نہیں لیکن کیوں سمجھ لیا جائے کہ وہ اپنے دینِ حقّہ کی تعلیم کا سہارا لے کر پھر اپنے پہلے درجہ پر نہیں پہنچ سکتے؟

(۶) مسلمان قوم اس دنیا میں نہایت حیرت انگیز کارنامے انجام دے چکی ہے اور اس کی سرگزشت کے دور سب کے لئے تعجب خیز ہیں۔ اس کے جوش ہمت اور عزم و جواں مردی کی داستانیں اپنی مثال آپ ہیں۔ کوئی دوسری قوم ان داستانوں کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ مسلمان ہی ہیں جنہوں نے پرانے زمانے کو کوچ کا پیغام دیا اور اس عہد کی بنیاد رکھی جسے تہذیب، شائستگی علم تحقیق اور کمال فنون کا خاص عہد کہا جاتا ہے۔

(۷) جن اصحاب میں روحانی ذوق تھا، ان کے لئے دل پسند شراب مسلمان ہی نے مہیا کی۔ وہی تھا جس نے عشق حق کے میدان میں شہسواری کے جوہر دکھائے۔ اس کی شراب خالص اور مصفا ہے۔ اس کی تیغ اصیل ہے جس کی کاٹ کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔

انسان فطرت و طبیعت کے اعتبار سے مختلف قسم کے ہوتے ہیں بعض میں روحانی ذوق بڑھا ہوا ہوتا ہے، بعض جہاد بالسیف کے شیدائی ہوتے ہیں، بعض اپنی زندگیاں علم و فن کی خدمت میں گزار دیتے ہیں ان کے لئے بہترین سامان اسلامی تعلیمات نے مہیا کئے۔

(۸) مسلم قوم سپاہی ہے۔ اس کی زرہ کلمۂ توحید کے سوا کچھ نہیں، یعنی وہ اس کلمہ کو لے کر اٹھتا ہے اور یہی اس کے جہاد کا پورا سروسامان ہے تلوار کے سایہ میں بھی اس کی پناہ لا الٰہ الا اللہ کے سوا کوئی نہیں، یعنی وہ توحید ہی کی دعوت دیتا ہے اور توحید ہی کو اپنی زندگی کا مقصد و نصب العین سمجھتا ہے۔ اسی کے لئے جیتا ہے اور اسی کی خاطر جان دیتا ہے۔ ایسی قوم کیوں کر

مٹ سکتی ہے۔

اقبال نے جو کچھ کہا ہے اسے شاعرانہ خیال نہ سمجھنا چاہیئے۔ ایک حدیث قدسی میں یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ مسلمانوں پر ایسا دور بھی آسکتا ہے، جب دشمنوں کا غلبہ بہت بڑھ جائے، لیکن یہ صورت کبھی پیدا نہ ہوگی کہ ان کی ہستی ہی باقی نہ رہے یا نشوونما کا وہ جوہر ختم ہو جائے جو قوموں کی زندگی کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ مسلمانوں پر مصیبتیں اس وقت آتی ہیں، جب وہ خدا کے احکام کی پیروی چھوڑ دیتے ہیں۔ پیروی کے ساتھ ہی ان میں عزت و سربلندی کی نئی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے مغلوب ہوئے، پھر جوش عمل اور ہمت و عزیمت کی بدولت زندگی کے نئے سروسامان سے آراستہ ہو گئے۔

پانچواں بند | نوری نہاد، جس کی فطرت نوری ہو۔

(۱-۲) اے مسجد قرطبہ! تجھے دیکھ کر بندہ مومن کی حقیقی شان آشکارا ہوتی ہے۔ اس شان کی خصوصیتیں کیا ہیں؟ یہ کہ مومن دن کے اوقات میں عشقِ حق کے جذبے سے سرشار ہو کر انتہائی سرگرمی اور جاں فشانی سے مصروفِ کار رہتا ہے۔ خدا کے حکموں کی تعمیل کرتا اور کراتا ہے۔ اس کے بندوں کے لئے راحت و آسائش کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ انہیں باطل قوتوں کی ضرر رسانی سے محفوظ رکھتا ہے۔ غرض اس کا سارا وقت ایسے ہی کاموں میں گزر جاتا ہے۔ رات آتی ہے تو وہ خدا سے لو لگاتا ہے۔ اس کے سامنے روتا ہے، دعائیں کرتا ہے۔ ہر کام میں اسی سے مدد اور نصرت کے لئے التجا کرتا ہے۔

یوں اس کے دن اور رات گزرتے ہیں۔ تو اس کی محنت، مشقت سرگرمی اور جاں فشانی کا ایک زندہ کارنامہ ہے۔ تو اس لئے تعمیر ہوئی کہ مومن رات کے اوقات میں تیرے اندر بیٹھ کر خدا کی بارگاہ میں دعائیں کرے۔ تیری عمارت کی رفعت اس کے مقام بلند کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ تیری وسعت سے اس کے بڑے بڑے ارادوں کا پتا چلتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خیالات کتنے وسیع ہیں۔ پھر اس نے تجھے انتہائی ذوق شوق سے بنایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ذوق و شوق کتنا پاکیزہ تھا۔ تو اس غرض سے بنی کہ مومن تجھ میں خدا کے سامنے سجدۂ نیاز کرتا رہے۔ اس نیاز مندی میں بھی ناز کی ایک عجیب شان آشکارا ہے۔ یہ تیرے چپے چپے کے حسن تعمیر سے ٹپک رہی ہے۔

(۳) بندۂ مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے، خدا کے لئے کرتا ہے۔ اس کا کوئی عمل ذاتی غرض سے آلودہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اللہ اپنی رحمت سے اس کے ہاتھ میں اپنے ہاتھ کی شان پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً مومن کا ہاتھ خدا کے ہاتھ کی طرح سب پر غالب رہتا ہے۔ وہ سب کو صحیح کاموں کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ کسی کے کام میں رکاوٹ پیدا ہو جائے تو اسے دور کر دیتا ہے۔ اور کسی کا سلسلۂ کار بگڑ جائے تو اسے سنوار دیتا ہے یعنی مومن کی برکت سے لوگوں کی سرگرمیاں صحیح مسلک پر رہتی ہیں۔ ان کی مشکلیں آسان ہوتی ہیں۔ ان کی بگڑی بنتی ہے۔ باطل قوتوں کے لئے ابھرنے کا کوئی موقع نہیں رہتا۔

یہ شعر اس حدیث قدسی کا مفہوم پیش کرتا ہے، جو صحیح بخاری کی

کتاب الرقاق میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے۔ اس کا متعلقہ ٹکڑا یہ ہے:

مایزال عبدی	باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرا بندہ
یتقرب الیّ بالنّوافل	نفلوں کے ذریعہ سے میرے قریب
حتّٰی احبّہٗ۔ فاذا	ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس
احببتہ کنت سمعہ	سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اس کا کان
الّذی یسمع بہ	بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے
وبصرہ الّذی یبصر	اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے
بہ ویدہ الّتی	وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا
یبطش بھا ورجلہ	ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا
الّتی یمشی بھا۔	پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

جب انسان اپنا وجود رضائے الٰہی کے لئے وقف کردے اور سچا مومن بن جائے تو یقیناً اس کا ہر کام خدائی کام بن جاتا ہے، اس لئے کہ اس سے خدا کی رضا کے سوا کچھ مقصود نہیں ہوتا اور وہ عین خدا ہی کے حکم کے مطابق ہوتا ہے۔

(۴) بندۂ مومن اگرچہ جسم کے اعتبار سے خاکی ہوتا ہے، لیکن فطرت و طبیعت کے لحاظ سے اس کے نوری ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا۔ اس کے اندر اپنے آقا و مولا کی صفتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس کا بے نیاز دل دنیا اور عقبیٰ کی کسی چیز پر نہیں ٹھہرتا۔ اس کا مقصود ذات باری تعالیٰ کی خوشنودی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

(۵) اس کی امیدیں بہت تھوڑی ہوتی ہیں۔ وہ اپنے کسی کام کے لئے دنیا والوں سے اجر اور معاوضے کا خواہاں نہیں ہوتا۔ اس کی غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ اس دنیا میں خدا کی رضا پوری ہو جائے۔ کہنے کو یہ معمولی مقصد ہے لیکن حقیقت پر نظر رکھی جائے تو یہ مقصد نہایت عظیم الشان ہے۔ اس میں وہ تمام مقاصد آجاتے ہیں جنہیں اس دنیا کے بڑے بڑے انسانوں نے اپنا نصب العین بنایا۔ مثلاً خلق خدا کی بہتری اور بہبود، ان کا امن، عالم گیر اخوت و مساوات، تمام انسانوں کو خدا کے سچے بندے بنانا اور سب کو اسی کی چوکھٹ پر جھکانا۔ دنیا میں اس سے بڑے مقصد کیا ہو سکتے ہیں جو مومن کا نصب العین بنیں؟ اس کی پوری زندگی دیکھ کر انسانوں کے دلوں میں محبت اور احترام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ کسی پر عتاب کی نگاہ نہیں ڈالتا۔ ہر ایک کی دل نوازی کرتا ہے۔

(۶) وہ بات چیت کرتا ہے تو بہت نرمی سے۔ تلاش حق میں بہت سر گرمی دکھاتا ہے۔ میدان جنگ کا معاملہ ہو یا دوستوں کی محفل جم جائے، مومن دونوں جگہ پاک طینتی اور پاک بازی کا پیکر ہوتا ہے۔ یعنی وہ میدان جنگ یا مجلس شوریٰ میں کبھی خدا کی مقرر کی حدوں سے تجاوز نہیں کرتا۔ یہی پاک دلی اور پاک بازی کا پہلا اور آخری معیار ہے کہ انسان زندگی کے ہر شعبے اور ہر حصے میں خدا کے حکموں کے مطابق چلے اور ان سے بال برابر بھی اِدھر اُدھر نہ ہو۔ نیز وہ اپنی ہر حرکت میں صرف خدا کی رضا پیش نظر رکھے۔

(۷) دنیا میں مرد مومن ہی کا ایمان و یقین پر کار حق کا نقطہ ہے۔ اسی کی

وجہ سے یہاں خدائی احکام جاری ہوتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے خدا کی رضا لوگوں کا نصب العین بنتی ہے۔ لہٰذا وہی اس دنیا میں حقیقی چیز ہے۔ باقی جو کچھ ہے، وہ سراسر وہم، دھوکا اور مجاز ہے یعنی مردِ مومن کے ایمان و یقین کے سوا اس دنیا کی کسی شے کو پائداری اور استواری نصیب نہیں۔

(۸) مردِ مومن ہی عقلِ سلیم کا سرچشمہ ہے۔ اسی کو عشقِ حق کا حاصل کہا جا سکتا ہے۔ کائنات کی محفل میں جو رونق اور چہل پہل نظر آتی ہے، وہ اسی کے دم سے ہے۔

چھٹا بند | دینِ مبین: روشن دین یعنی اسلام۔ حرم: مرتبت، لفظی معنی کعبہ کے ہم رتبہ۔ مراد ہے انتہائی عزت و حرمت والی۔ اندلسی: وندالوشیا کا عربی تلفظ ہے۔ یہ ہسپانیہ کے ایک صوبہ کا نام تھا۔ مسلمانوں کے زمانے میں یہ لفظ پورے اسلامی ہسپانیہ کے لئے استعمال ہوتا رہا۔ خلقِ عظیم: اقبال نے ان دو لفظوں کو واوین میں لکھا ہے۔ گویا اس آیت کی طرف اشارہ مقصود ہے: اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ یعنی اے رسولؐ! آپ پیدا ہوئے ہیں بڑے خلق پر۔ اس آیت میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ کا ذکر ہے جو اس کائنات میں اخلاق کا بہترین نمونہ تھے۔ اقبال کی مراد یہ ہے کہ اندلس کے مسلمان انہیں پاکیزہ اخلاق کے حامل تھے جو حضرت رسول اکرم صلعم اس دنیا میں لے کر آئے تھے۔ رمزِ غریب: نادر، بھید، عجیب نکتہ۔ شرق و غرب: مشرق اور مغرب یعنی ساری دنیا۔ گرم اختلاط: میل جول میں پرتپاک۔

(۱) اے مسجد! جن لوگوں نے فن تعمیر میں درجۂ کمال حاصل کیا، تیری عمارت ان کے لئے کعبہ کا حکم رکھتی ہے یعنی انتہائی عزّت کی مستحق ہے اور وہ لوگ اس سے تعمیر کے نئے نئے نکتے سیکھتے ہیں۔ تیری وجہ سے دین اسلام کی شوکت و عظمت نمایاں ہے۔ تیری برکت سے اندلسیوں کی سرزمین، یعنی خود اندلس، انتہائی عزّت و احترام کی مستحق بن گئی۔

(۲) اس آسمان کے نیچے تیرے حسن و خوبی کی اگر کوئی مثال ہے، تو وہ روئے زمین پر تو موجود نہیں، البتہ مسلمانوں کے قلب میں مل سکتی ہے یعنی مسلمان ہی پھر ایسی خوب صورت اور عالی شان عبادت گاہ بنا سکتے ہیں اور کوئی نہیں بنا سکتا۔

(۳) مندرجۂ بالا شعر کہتے ہی اقبال کے دل میں مسجد کے بانیوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ فرماتے ہیں: آہ خدا کے وہ پاک بندے، وہ عرب کے شہسوار جو حضرت رسول اکرم صلعم کے اخلاق عالیہ کا نمونہ تھے۔ وہ جنہیں سچائی، ایمان داری راست بازی اور یقین میں نہایت اونچا مرتبہ حاصل تھا۔

(۴) وہ جن کی حکومت نے یہ عجیب و غریب نکتہ دنیا پر واضح کیا کہ دل والوں کی سلطنت فقیری ہوتی ہے بادشاہی نہیں، یعنی وہ اس لئے نہیں آئے کہ بڑے بڑے محل بنائیں اور اپنے گرد عظمت و برتری کے حیرت انگیز سامان جمع کرلیں۔ وہ فقر و درویشی کا تحفہ لے کر آتے ہیں۔ جو کم سے کم میں گزارہ کرتے ہیں اور ہر چیز خلق خدا کی بہتری، بہبود اور راحت و آسائش کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ یہی وہ سلطنت ہے، جس کا پیغام اسلام دنیا میں لایا۔ یہی وہ حکم رانی ہے، جس کا

بہترین نمونہ خلافت راشدہ نے پیش کیا۔ جو عرب اندلس پہنچے تھے، وہ بھی یہی نمونہ لے کر گئے تھے اور اسی کی وجہ سے خود اندلسی مسیحیوں نے اپنے بادشاہ کو چھوڑ کر مسلمان عربوں کا ساتھ دیا تھا۔

(۷) وہی مردان حق تھے جنہوں نے مشرق و مغرب کو صحیح تربیت دی اور یورپ کے اندھیرے میں صرف وہ تھے، جن کی عقلیں صحیح راستہ دیکھنے والی تھیں۔ انہیں کی بدولت یورپ میں علم و دانش کے چراغ روشن ہوئے اور ایل یورپ کے لئے وحشت و جہالت کے دور سے نکل کر علم و تہذیب کے دور میں آنے کا سر و سامان فراہم ہوا۔

یہ تاریخی حقیقت ہے اور خود یورپی مورخ کھلے بندوں اس کی شہادت دے رہے ہیں۔

(۸) خلق عظیم کے وہی پیکر تھے جن کا لہو آج تک اندلسیوں کی رگوں میں دوڑ رہا ہے اور یورپ کی دوسری قوموں کے مقابلے میں اندلس کے باشندے خوش دل، مہمان نواز، میل جول میں پر تپاک، سادہ مزاج اور روشن پیشانیوں والے یعنی خوب صورت ہیں۔

(۹) اندلس میں آج بھی ہرن جیسی آنکھیں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں اور حسینوں کی نگاہوں کے تیر آج بھی دل میں ترازو ہوتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ حسن کی یہ علامتیں عربی خون کی آمیزش کا نتیجہ ہیں۔

(۱۰) اندلس کی فضاؤں میں آج بھی یمن کی خوشبو موجود ہے اور اس کے نغموں میں آج بھی حجازی رنگ نمایاں ہے۔

بوئے یمن سے اشارہ اس مشہور مگر غیر مستند حدیث کی طرف بھی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت رسول اکرم صلعم کو یمن کی جانب سے ٹھنڈی ہوا آئی۔ بظاہر اس سے یہ مراد ہے کہ جو عرب ابتدا میں اندلس جاکر آباد ہوئے ان میں بڑا حصہ یمن کے عربوں کا تھا اور ان کی نسل اب بھی وہاں موجود ہے۔ نیز اندلس کی موسیقی دوسرے یورپی ملکوں کی موسیقی کے مقابلہ میں مجازی موسیقی سے مشابہ ہے۔

ساتواں بند | المنی: جرمن۔ اصلاح دین: مراد ہے ریفرمیشن (Reformation) سے یعنی مذہبی اصلاح کی وہ تحریک جو مارٹن لوتھر باشندۂ جرمنی نے یورپ کے خلاف اٹھائی تھی اور جس کی بنا پر عیسائیت دو بڑے ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ پوپ کے ماننے والے کیتھولک کہلاتے رہے۔ لوتھر کو ماننے والوں کا نام پراٹسٹنٹ پڑ گیا۔ لوتھر کا عقیدہ یہ تھا کہ نہ پوپ معصوم ہے، نہ وہ کسی کے گناہ معاف کر سکتا ہے۔ پیر کنشت: لفظی معنی کلیسا کا سب سے بڑا بزرگ یعنی پوپ۔ انقلاب فرانس: یہ انقلاب فرانس کی شہنشاہی کے خلاف تھا۔ چنانچہ بادشاہ، ملکہ اور بڑے بڑے امیر قتل کر دیئے گئے اور جمہوریت قائم ہو گئی۔ پھر نپولین برسر کار آ گیا اور فرانس میں از سر نو شہنشاہی کا تخت بچھ گیا، لیکن انقلاب فرانس کی بدولت یورپ میں شہنشاہی کی جڑ پر کلہاڑے چلنے لگے۔ ملت رومی نژاد: مراد ہے اہل اٹلی سے۔ لذت تجدید: لفظی معنی تازہ کرنے کی لذت اس مصرع میں اشارہ اٹلی کی اس عظمت و برتری کی طرف ہے، جو اسے مسولینی کی ماتحتی میں حاصل ہوئی،

لیکن دوسری جنگ یورپ میں یہ عظمت بھی یورپ کی بعض دوسری عظمتوں کی طرح حرف غلط کی مانند مٹ گئی۔ گنبد نیلوفری، آسمان۔

(۱) اے مسجد! ستاروں کی نظروں میں تیری زمین کو آسمان کا رتبہ حاصل ہے یعنی وہ بہت بلند رتبہ ہے۔ آہ! کہ صدیاں گزر گئیں اور تیری فضا میں اذان کی آواز نہیں سنی گئی۔ یعنی کسی نے تیرے صحن یا مأذنے سے اذان نہیں کہی۔

(۲) کچھ معلوم نہیں کہ ہنگامے پیدا کرنے اور ہلچل ڈالنے والے عشق حق کا سخت جان قافلہ کون سی وادی اور کون سی منزل میں مقیم ہے؟ وہ کب یہاں پہنچے گا؟ اور کب تیری فضا میں اللہ اکبر کی صدائیں پھر اسی طرح گونجنے لگیں گی، جس طرح اسلامی دور میں ساڑھے سات سو سال تک گونجتی رہیں۔

(۳) ملک ملک میں انقلاب پیدا ہوئے۔ جرمنی سے اصلاح دین کی تحریک اٹھی، جس نے پرانے زمانے کے تمام نقش مٹا کر رکھ دیئے۔

(۴) پوپ کی جس معصومی پر عیسائیت نے ایک وسیع مذہبی نظام تیار کیا تھا، وہ معصومی حرف غلط کی طرح محو ہو کر رہ گئی۔ اس عہد میں کسی کو سوچنے اور غور کرنے کی اجازت نہ تھی۔ کوئی شخص بائبل کا ترجمہ نہ کر سکتا تھا اور مذہب کے متعلق کوئی رائے نہ دے سکتا تھا۔ سب کی گردنیں پوپ اور اس کے مقرر کئے ہوئے کارکنوں کے سامنے جھکی رہتی تھیں۔ وہ جو کچھ کہہ دیتے تھے، اسی کو نجات کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، لیکن جب لوتھر کی تحریک نے پوپ کی معصومیت ختم کی تو لوگ دین غور و فکر کرنے لگے حقیقت حال ان پر آشکارا ہوئی۔ اسی وقت سے پرانا مذہبی ڈھانچا بالکل برباد ہو گیا۔ اسی وقت

سے آزادیٔ فکر کا وہ دور شروع ہوا جس نے آگے چل کر یورپ کو لادینی کی راہ پر ڈال دیا۔

اقبالؔ کا کمال یہ ہے کہ فکر کی کشتی کو نازک بتایا۔ یقیناً وہ اتنی نازک ہوتی ہے کہ موج کا ہلکا سا تھپیڑا بھی اسے تختہ تختہ کر دے سکتا ہے۔

(۵) فرانسیس کی آنکھ نے انقلاب کا نقشہ دیکھ لیا، جس میں نہ محض فرانس کی پرانی شہنشاہی ہی ختم ہوئی، بلکہ یورپ کے پورے پرانے نظام سلطنت میں الٹ پلٹ شروع ہو گئی، یعنی دوسرے ملکوں میں بھی بادشاہی کو ختم کر کے جمہوریتیں قائم ہونے لگیں اور وہاں نئی تہذیب نے فروغ حاصل کیا۔

(۶) رومی نسل کی ملت، یعنی اہل اٹلی جو پرانی چیزوں کی پرستش کرتے تھے، بوڑھے ہو گئے تھے، وہ مسولینی کی رہنمائی میں تجدید کی لذّت سے جوان بن گئے، یعنی ان میں بھی زندگی کی نئی روح پیدا ہو گئی اور وہ عظمت و برتری کے دعوے کرنے لگے۔

(۷) مسلمان کی روح میں بھی آج وہی بے قراری، وہی تڑپ انگڑائیاں لے رہی ہے، اس کا نتیجہ کیا ہونے والا ہے؟ یہ خدائی بھید ہے زبان میں یہ طاقت نہیں کہ اسے کھول کر بیان کر سکے

(۸) سمندر میں طوفان کے آثار نمودار ہیں۔ دیکھیں اس کی تہ سے اچھل کر کیا نکلے گا؟ اور یہ نیلا آسمان جو ہمارے سر پر چھایا ہوا ہے، کیا رنگ بدلے گا؟

آٹھواں بند | آب رواں کبیر: وادی الکبیر اندلس کا مشہور دریا، جس کے دونوں کناروں پر قرطبہ آباد ہے۔ مسجد قرطبہ بھی اس دریا کے قریب ہی واقع

رہتی ہے اور قدرت کے ہاتھ میں تلوار کا کام دیتی ہے، یعنی اسی سے قدرت اپنے تمام کام لیتی ہے۔

(۸) جن نقوش میں جگر کا خون شامل نہ ہو، وہ نامکمل رہتے ہیں۔ خون جگر کے بغیر شاعری بھی سوائے خام کے سوا کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

خلاصۂ مطالب | یہ لمبی نظم ہے، لہٰذا اس کے مطالب کا خلاصہ بیان کر دینا ضروری ہے تاکہ خوانندگان کرام کو نظم کا سلسلۂ فکر ذہن نشین کرنے میں سہولت رہے۔

(۱) پہلے بند میں یہ بتایا گیا ہے کہ کائنات کی ہر شے زمانے کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور اس دنیا کے لئے ثبات کی کوئی صورت نہیں۔

(۲) دوسرے بند میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو نقش کسی مرد خدا کے ہاتھوں ثبت ہو، اس میں ہمیشگی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مرد خدا کے تمام کام عشق حق کی بدولت انجام پاتے ہیں اور عشق حق زمانے کی رو کو بھی روک لیتا ہے۔ ساتھ ہی عشق کے مختلف مظاہر و اوصاف کا ذکر کیا ہے۔

(۳) تیسرے بند میں مسجد قرطبہ سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے کہ تجھے بھی عشق حق ہی کی بدولت پائداری نصیب ہوئی۔

(۴) چوتھے بند میں مسجد کے حسن و شکوہ کا ذکر کرتے ہوئے ملت اسلامیہ کی پائداری کا پیغام دیا ہے۔

(۵) پانچویں بند میں مسجد ہی سے خطاب کرتے ہوئے مرد مومن کے اوصاف بتائے ہیں۔

(۶) چھٹے بند میں ان عربوں کے اوصاف و خصائص پیش کئے ہیں، جن کے ہاتھوں اندلس فتح ہوا اور مسجد تعمیر ہوئی۔

(۷) ساتویں بند میں یہ بتایا ہے کہ یورپ کی مختلف قوموں میں انقلابات آچکے، ملّت اسلامیہ کی روح میں بھی انقلاب کی لہریں اُٹھ رہی ہیں، دیکھیں، نتیجہ کیا نکلے۔

(۸) آٹھویں اور آخری بند میں قرطبہ کے بعض دل کش مقامی مناظر کا نقشہ پیش کرتے ہوئے یہ پیغام دیا ہے کہ نیا دور آنے والا ہے، اور جس زندگی میں انقلاب نہ ہو، وہ موت کے برابر ہے۔ قوموں کی روح کشمکشِ انقلاب ہی کی بدولت زندہ رہتی ہے۔